ایک دلچسپ اور تفریحی میگزین

نئے اُفق

ابنِ صفی نمبر

ابن صفی

صفحہ دل

دولت غم اپنے ہی اوپر ہم نے خوب لٹائی
سارے جہاں میں کوئی نہ ہوگا ہم سا حاتم طائی

ہم نے کہا تھا پچھتاؤ گے جانے کیسی بات تھی
مجھ نے منہ سے نکلی ہوئی بھی بات ہنسی کی لڑوائی

فہم و فراست خواب کی باتیں جاگتی دنیا پاگل ہے
عقل کا سورج ماند ہوا ہے ذروں کی بن آئی ہے

دریا کی گہرائی ناپو موتی ہاتھ لگیں گے
کیا پاؤ گے ناپ کے یارو جذبے کی گہرائی

اپنی ذات میں ڈوبنے والے پہروں اونگھے لوگ
سب کا درد بٹانے والے لاکھوں ہرجائی

سود و زیاں کے بازاروں میں ڈھونڈھا پایا اپنا کل ہم
بن بیوپار کسی نے قیمت دو کوڑی نہ لگائی

ابنِ صفی کے دو خط

۲۵ رمئی ۱۹۸۰ء

اِیثار بیٹے! دُعائیں۔

تمہارے سب خطوط مل گئے ہیں لیکن پریشانیوں کی وجہ سے جواب نہ لکھے گئے۔ ۱۷ رجون کو ساڑھے آٹھ بجے شب کو امّاں ہم سے جُدا ہوگئیں۔ اِنا للہِ و اِنا الیہِ راجعون۔

تم دینی معاملات میں مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہو۔ اس لیے بیٹے صبر کرنا خود کو سنبھالنا کہ وہاں تنہا ہو۔ ہم سے دُور ہو۔ دن بھر اچھی بھلی رہی تھیں۔ عصر کی نماز پڑھ چکی تھیں کہ چوکی ہی پر حالت بگڑ گئی۔ چوکی سے اُٹھا کر پلنگ پر لِٹا دیا گیا اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ ہوش نہیں تھا لیکن ہونٹ ہل رہے تھے اور انگوٹھا اُنگلیوں کے پوروں پر اس طرح چل رہا تھا جیسے تسبیح کر رہی ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر اور احسان ہے کہ مَیں گھر ہی پر موجود تھا۔ . . تمہاری آپا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ بہت متاثر ہیں۔ بہر حال، بیٹے صبر کرنا اور اُن کی مغفرت کے لیے دُعا کرنا۔ اپنی خیریت سے جلد جلد مطلع کرتے رہنا۔

دُعا گو

اسرار۔

---

۲۳ رجون ۱۹۷۹ء

اِیثار بیٹے!

دُعائیں۔ آج تمہارا تار مِلا۔ احمن برابر تمھیں خط لکھتے رہتے ہیں۔ چار پانچ دِن ہُوئے، ایک بے حد مفصّل رجسٹرڈ لیٹر (اپنی عادت کے مطابق) تمھیں لکھ چُکے ہیں جسے خود میں نے پوسٹ کرایا تھا۔ تم غالباً یہ سُن کر پریشان ہوگئے ہوگے کہ خون پھر چڑھایا گیا تھا۔ ہیموگلوبن کی کمی ہوگئی تھی۔ اس لیے ڈاکٹر کے مشورے سے ایک پائنٹ خون چڑھایا گیا تھا۔ بحمداللہ تیزی سے صحت یابی کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ کچھ تھوڑی بہت کھانسی بھی ہو جاتی ہے۔ تم بالکل کِسی قِسم کی کوئی فکر نہ کرو۔ آج نازو اور علی آئے ہُوئے ہیں۔ احمن وغیرہ چکن کارن سوپ کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ تمہاری کمی شدّت سے محسوس ہوتی ہے۔ اگست میں انشا اللہ تم آؤ گے پھر ہنگامے رہیں گے۔ تم کِسی قِسم کے تردّد کے بغیر چھٹیوں میں آجانا۔ تمہاری آپا دُعا کہہ رہی ہیں اور سب لوگ سلام کہتے ہیں۔ تمھارے لِکھنے کے مطابق احمن، زبیر صاحب کے آفس گئے تھے۔ وہاں معلوم ہُوا کہ وہ رُوم گئے ہُوئے ہیں۔

دُعا گو

اسرار

پَر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

(عیدالاضحیٰ کے موقع پر ابّو کے نام)

از : روم

اِیثار احمد صفی

۱۹ راکتوبر ۸۰ء مطابق ۱۰ رذی الحجہ

پیارے ابّو السلام علیکم (ورحمتہ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ)

میں بفضلہ تعالیٰ خیریت سے ہوں اور خداوندکریم سے آپ کی خیریت خُلدِ بریں میں نیک مطلوب ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک خط لِکھ چُکا ہوں اُمید ہے کہ مِل گیا ہوگا۔ میں بالآخر ڈیڑھ ماہ کی تعطیلات گزار کر واپس رُوم پہنچ گیا ہوں لیکن ابّو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اِن چھٹیوں میں، مَیں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو... جس کا اثر بیدار ہونے کے بعد بھی برقرار ہے۔ ہر چند کہ مَیں اس بھیانک خواب کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ہر کوشش بے سُود ہے۔ مجھے آج اپنے اُن خیالات پر ہنسی آتی ہے جو کہ میرے ذہن پر رُوم سے کراچی جاتے ہُوئے چھائے ہُوئے تھے۔ . . . ابّو! یقین جانیے، راستے بھر میں آپ ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرا خیال تھا شاید آپ اپنی بیماری کی وجہ سے ائرپورٹ نہ آسکیں گے تو کم از کم میں آپ کو گھر کے دروازے پر اپنا منتظر پاؤں گا پھر آپ مجھے اپنے سینے سے لگائیں گے، جس طرح رُخصت ہوتے ہوئے آپ نے مجھے لگایا تھا . . . لیکن میں ائرپورٹ پر جہاز کی سیڑھیوں سے ابھی اُترنے بھی نہ پایا تھا کہ اپنے دو بزرگوں کو جہاز کی سیڑھیوں کے پاس اپنا منتظر دیکھا میرے جسم میں ایک عجیب سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایک ایسی سنسنی جو کسی حادثے کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ہزار ہا قسم کے وہم ایک لمحے میں ذہن میں اُبھرے لیکن میں نے بہت ہمت کے ساتھ جہاز کی سیڑھیاں مکمل کیں۔ . . . لیکن اس کے بعد آنے والے لمحات میں مجھے ایسا لگا جیسے دُنیا اب بالکل خالی ہوگئی ہو . . . کچھ خواب ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گئے۔ آنسو بھی اتنی جلدی میں یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ یہ کیا ہوگیا؟ . . . حواسوں نے ذرا دیر کے لیے جواب دے دیا لیکن دوسرے ہی لمحے جب میری نظر تینوں بھائیوں پر پڑی، جو سر جھکائے یوں میرے سامنے کھڑے تھے جیسے شاید اُن سے کوئی خطا ہُوئی ہو . . . یا وہ نظر ملتے ہی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں۔ میں نے ان کی خاطر اپنے آپ کو سنبھالا پھر میں سب سے مِلا . . . ملتا رہا . . . اور آخری دن تک ملتا رہا۔ کِسی نے صبر کی تلقین کی۔ کِسی نے ہمت سے کام لینے کو کہا لیکن ابّو میری سمجھ میں یہ آج تک نہ آسکا، کیا واقعی یہ سب حقیقت تھی؟ کاش! کوئی کہہ دے، یہ سب خواب تھا . . . کاش! اس خواب سے بیدار کرنے والے آپ ہوں۔ جو مجھ سے صبح کے وقت کہہ رہے ہوں "اِیثار بیٹا! اُٹھو . . . ورنہ یونیورسٹی کی دیر ہو جائے گی"۔ اوہ ابّو . . . معاف کیجیے گا، مَیں پھر آپ کے احکامات سے روگردانی کر گیا لیکن میں کیا کروں؟ آج عید کا دِن ہے۔ آج نہ جانے پردیس میں یہ دن مجھے کیوں بہت زیادہ کھل رہا ہے؟ شاید اس وجہ سے کہ یہاں سے سینکڑوں میل دُور گھر والوں کے ساتھ آج آپ عید کے دِن شریک نہ ہوں گے۔ نہ جانے اُن لوگوں پر یہ دِن کیسا گزر رہا ہوگا؟ ابّو میں تو ہر لمحے یہ دُعا کرتا ہُوں کہ خدا میری ماں اور بہن بھائیوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے . . . صبر . . . ؟ جس کے معنی شاید دُنیا کی کسی ڈکشنری میں واضح نہ ملیں۔ کاش! مَیں بتا سکتا لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں بھی قاصر ہوں لیکن ابّو میں آپ کے حکم کے مطابق صبر کی کوشش کروں گا۔ آج میں تنہا بیٹھا تھا اس لیے سوچا کہ آپ ہی سے کچھ دیر بات کرلی جائے کیوں کہ سُنا تھا کہ خط آدھی ملاقات ہوتی ہے . . . لیکن ابّو! یاد رہے کہ میں اب بھی پوری ملاقات کا متمنی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میرے خط کا جواب ضرور دیں گے تاکہ میں وقتاً فوقتاً آپ سے کچھ دیر بات کرکے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کروں۔

والسلام

آپ کا فرمانبردار۔ دُعاؤں کا طالب ایثار

عدم آباد
۲۱/۱/۸۰
مطابق ۱۲ ذی الحجہ

ایثار بیٹے

دعائیں

تمھارے دونوں خطوط ملے۔ اگرچہ یہ مشیتِ ایزدی نہیں ہے کہ عدم آباد سے دنیائے فانی خطوط لکھے جائیں لیکن تمھارے لیے بارگاہِ الٰہی سے اجازتِ خاص مرحمت ہوئی کہ تمھیں جواب دیا جائے۔ بیٹے دل سے نکلی ہوئی ہر بات اثر رکھتی ہے۔ دل سے نکلی ہوئی ہر بات تو عرشِ معلّٰی کو بھی ہلا دیتی ہے لیکن جو دل صبر سے بھرا ہوتا ہے اس کے مقام کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ صبر تو نام ہی اپنے آپ کو مشیتِ ایزدی میں راضی رکھنے کا ہے۔ صبر کی مکمل نمونہ وہ ہستی ہے جو کہ وجودِ کائنات ہے جس کے ایک اشارے پر پہاڑ سونا اُگل سکتے ہیں۔ زمین کی ریت اور کنکر ہیرے اور جواہرات بن سکتے ہیں جس کی ایک خواہش پر پانی کی ندیاں دودھ اور شہد کی ندیوں میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ ایسی ہستی کو خدائے پاک نے یتیم پیدا کیا پھر یتیم پرورش پائی ۔ ۔ ۔ پھر بعثت کے بعد صعوبتیں اُٹھائیں۔ اُس عظیم ہستی پر سلام اور درود ہو جس نے عالمِ انسانیت کو ہر حال میں صبر اور شکر کرنے کی تعلیم دی اور اس نے اس دنیا میں اس طرح رہنے کو پسند کیا جیسا کہ ایک معمولی انسان رہتا ہے۔ دنیا میں چاہے تمھیں کیسی ہی آزمائشوں سے گزرنا پڑے لیکن تم صبر کا دامن ہرگز مت چھوڑنا۔ ہماری مثال تو اُس غلام کی سی ہے جس کا آقا اس پر مکمل اختیار رکھتا ہے کہ اُسے جیسے چاہے، استعمال کرے لیکن غلام کو کچھ بولنے کا حق حاصل نہ ہو اور کبھی بھی کوئی آقا اپنے غلاموں کو بغیر آزمائے اور پرکھے انعام و اکرام نہیں دیا کرتا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ آزمائش بھی اُسی کی ہوتی ہے جس کو انعام و اکرام سے نوازنا ہو ۔ ۔ ۔ پس بیٹا۔ ہر حال میں صبر و شکر سے کام لینا کہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں پر تمام اوّلین سے ملاقات ہوئی۔ یہاں پہنچ کر یہ بات عیاں ہوئی کہ وہ دنیا واقعی دُکھوں کا گھر ہے۔ ہم دنیا میں رہ کر یہ سمجھتے تھے کہ کسی نے طویل حیات پائی اور کسی نے قلیل ۔ ۔ ۔ لیکن اگر یہاں کے پیمانے پر ناپا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کم و بیش یکساں حیات پاتے ہیں۔ موت جو کہ وہاں اختتامی چیز نظر آتی ہے، دراصل وہ اُس دنیا سے یہاں منتقلی کا ایک عمل ہوتا ہے۔ اصل چیز انسانی روح ہوتی ہے۔ جب خدائے بزرگ و برتر نے تمام روحوں کو پیدا فرمایا تو انہوں نے خدا تعالیٰ کو ربّ تسلیم کیا تھا۔ اب اُن روحوں کے قول کی جانچ اور آزمائش کے لیے اس میں سے ہر ایک کو ایک جسدِ خاکی کے ساتھ، ایک نظام کے تحت اُس دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ اُسے سابقہ عالم بھلا دیا جاتا ہے۔ جب انسانی جسم جوان ہوتا ہے اور قویٰ مضبوط ہوتے ہیں تو اس وقت روح کا امتحان اور آزمائش شروع ہوتی ہے۔ اس کو دیا ہوا جسدِ خاکی اُن اصولوں پر چلانا ہوتا ہے جو کہ محمدؐ عربی لے کر اُس دنیا میں گئے تھے۔ جسدِ خاکی کو اُن اصولوں پر چلانے والی قوّت کو ایمان کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر کبھی قوی جسدِ خاکی اُن حقائق کو نہ مانے تو سنِ ضعیفی کو پہنچ کر ماننے پر تیار ہو ہی جاتا ہے۔ بہرکیف ہمارا آقا بہت رحیم اور غنی ہے۔ وہ تو اپنے بندوں کو عدم آباد کی کامیابیاں دینے کے لیے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ نہ جانے اس جیسے کتنے راز ہیں جس پر قدرت نے مصلحت کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم سے کچھ اور کہوں ۔ ۔ ۔

لیکن ہمیں یہاں سے خدائے بزرگ و برتر کے رازوں کو فاش کرنے کی اجازت نہیں۔ اُس دنیا میں اکثر راز قوی روحوں والوں، جنھیں تم لوگ ولی اللہ کہتے ہو، ظاہر ہوتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں وہ لوگ بھی خدا کے رازوں کو کھولتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ دنیا کے انسان اس کے متحمل نہ ہو سکیں گے۔ بیٹے! یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ اُس دنیا کے ماحول میں جو شخص بھی احکامِ الٰہی پر خود چلنے کی کوشش کرے گا اور دوسروں کو بھی حکمت کے ساتھ بلائے گا وہ یقیناً کامیاب و کامران ہوگا۔ بیٹے! میں نے ہر چند اپنی زندگی میں اِس بات کی کوشش کی کہ میں لوگوں کو مصلحت اور حکمت سے صحیح راستہ دکھا سکوں میں نے اِس بات کا بیڑا اُس وقت اُٹھایا جب ہمارے معاشرے کو تباہ کرنے کی سازشیں ہو رہی تھیں جنسی اشتراکی اور لادینی خیالات رکھنے والے لوگ ہمارے معاشرے میں داخل ہو چکے تھے۔ جب میں نے اُن لوگوں کو ادب کے دروازے پر دیکھا تو میں نے اُن کا وہاں مقابلہ کیا ۔ ۔ ۔ مجھے اس دنیا میں کبھی کسی سے بھی صلے کی تمنا نہیں رہی لیکن خدائے بزرگ و برتر کا شکر ہے کہ ایک بڑے طبقے نے، جس میں نوجوان بھی شامل ہیں، میرے اشارے کو پالیا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اشاروں اور کنایوں میں دیے ہوئے پیغام کردہ لوگ ہمیشہ مدِنظر رکھیں گے اور ہمارے معاشرے کے درپردہ دشمن عناصر سے محتاط رہیں گے۔ بیٹا! اُس دنیا میں اِس طرح سے زندگی گزارنا چاہیے کہ ایک مسافر گزارتا ہے جس کے کوچ کا وقت کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ ہمیشہ اپنے بڑوں کی عزت کرنا اور چھوٹوں پر شفقت کرنا اور جس جس کا حق تم پر بنتا ہے اُس کو ادا کرنا لیکن کبھی اپنا حق مانگنے میں عجلت مت کرنا ۔ ۔ ۔ بیٹے یہ چند بنیادی اصول ہیں جو کہ ہمارے نبیؐ نے ہم سب کو تعلیم کیے تھے۔ یقیناً یہ وہ اصول ہیں جس کے آگے دنیا کے تمام خود ساختہ نظام ہیچ اور باطل ہیں۔ ان اصولوں پر ہی چل کر تم دنیائے فانی اور عدم آباد کی کامیابیوں سے ہمکنار ہو گے۔ تم سب لوگوں کے بھیجے ہوئے ھدیات مجھے مل گئے ہیں۔ بیٹا یاد سے مظاہری صاحب کو مدینہ خط ضرور لکھ دینا۔ اُن کا بھیجا ہوا حج کا تحفہ مل گیا ہے۔ اپنی ماں اور بہن بھائیوں کا خاص خیال رکھنا۔ دلجمعی کے ساتھ تعلیم کی طرف توجہ دینا ۔ ۔ ۔ باقی اللہ بہت مسبب الاسباب ہے۔ وہی تمھارا حامی و ناصر ہے۔

دعاگو
ابوّ
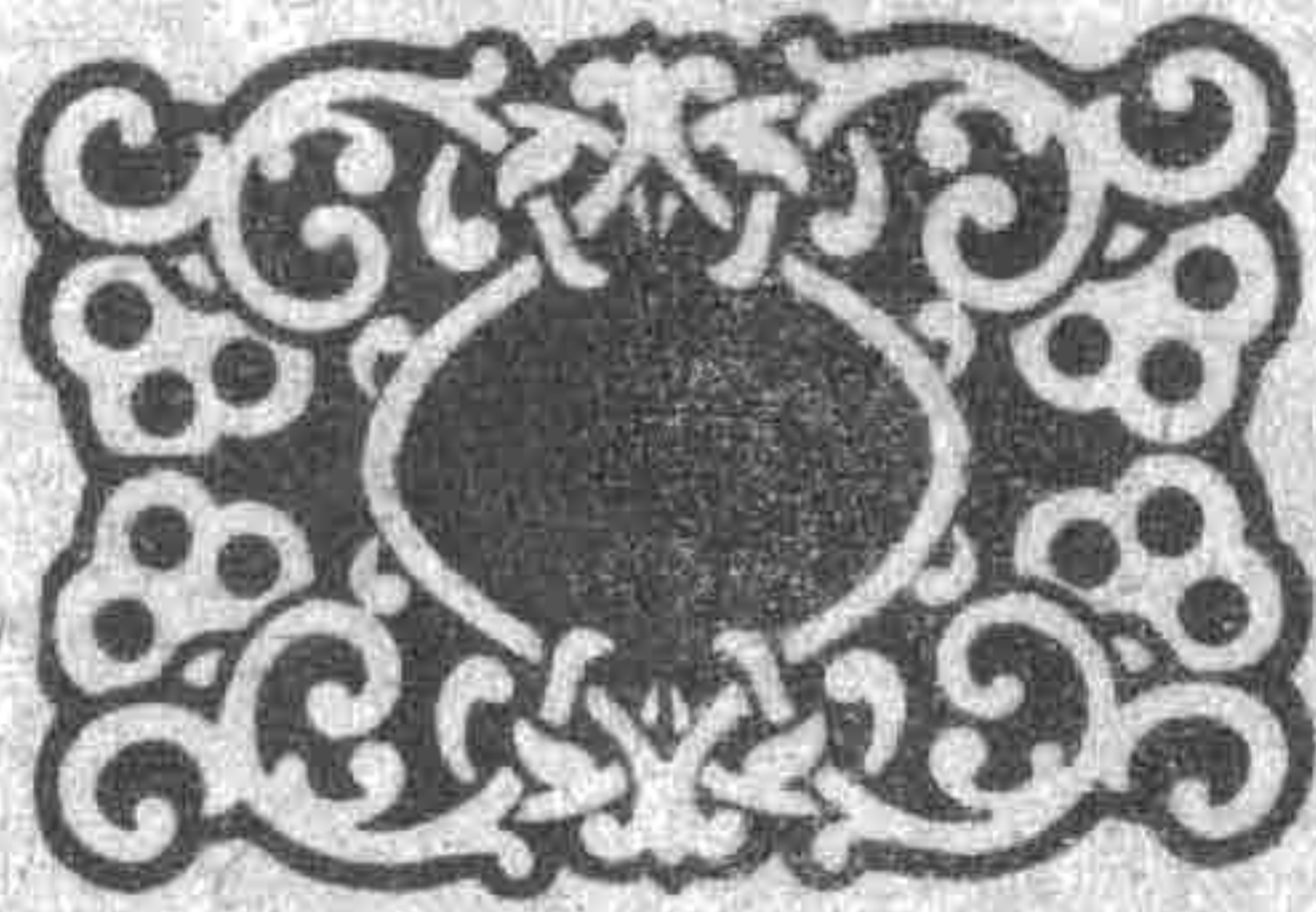
بیگم سلمیٰ ابنِ صفی سے ملاقات

مشتاق احمد قریشی

ابنِ صفی نمبر کی تیاری یوں تو دو ماہ قبل ہی شروع ہو گئی تھی لیکن آخری دنوں میں کام اتنا بڑھ گیا کہ اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ ابنِ صفی میگزین کا ایڈیٹر اظہر کلیم میرا پرانا اور وفادار ساتھی ہے۔ ابنِ صفی اسے بہت چاہتے تھے اور اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ 'مشتاق میاں اظہر کا خیال رکھا کرو'۔ میں ان دنوں سوچا کرتا تھا بلکہ آج بھی سوچتا ہوں کہ جو شخص خود بے پناہ خیال رکھنے والا ہے، اس کا خیال رکھنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ اب یہی دیکھ لیجئے کہ مسلسل ایک ماہ سے میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا کہ 'ابنِ صفی نمبر' کے لیے بیگم سلمیٰ ابنِ صفی اور ابنِ صفی صاحب کے برادرِ نسبتی جناب مبین احسن کے انٹرویو ہر حال میں لیے جائیں۔ ان کے بغیر نمبر مکمل نہیں ہو گا۔ میں کاروباری مصروفیات اور اپنی اہلیہ کی ناسازئ طبیعت کے باعث کہیں آ جا نہیں سکتا تھا لیکن کل اظہر کلیم نے مجھے وارننگ دے دی تھی کہ انٹرویو لیے بغیر دفتر میں نہ گھسوں، اس لیے آج ۱۰ جولائی کو میں جلتی ہوئی دوپہر میں، محترم ابنِ صفی کے گھر واقع ناظم آباد پہنچا تو حسبِ معمول احمد صفی نے میرا استقبال کیا اور مجھے لے جا کر کمرۂ نشست میں بٹھا دیا۔ برخوردار ابرار صفی آئے تو علیک سلیک کے بعد میں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ انہوں نے اپنی والدہ محترمہ سے میری خواہش کا اظہار کیا تو وہ کمرۂ نشست سے ملحق کمرے میں تشریف لے آئیں اور ابرار کو آواز دے کر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے بعد سلام، مدعا بیان کیا تو اُن کی پُر شفقت آواز میرے کانوں میں رس گھول گئی۔
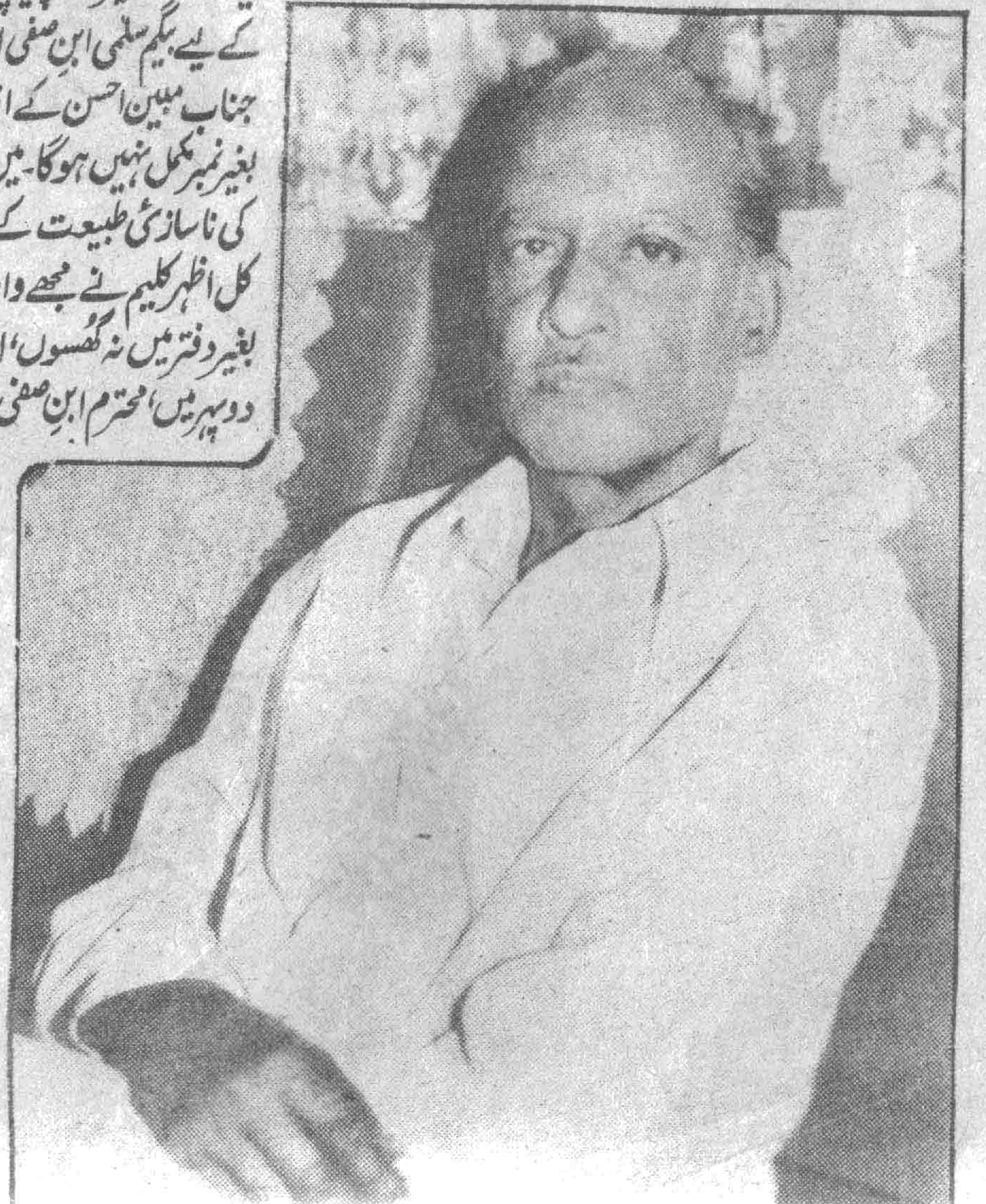
"آپ، ان کے مخلص دوستوں میں سے ہیں۔ اس لیے میں آپ کی دل سے عزت کرتی ہوں۔ آپ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں پُوچھ لیجئے۔ میں حاضر ہُوں۔"

ان کے لہجے میں وہی انکسار تھا جو محترم ابنِ صفی کے لہجے میں پایا جاتا تھا۔ یہ انکسار ہی ان کی عظمت کا مظہر ہے۔ شدتِ عقیدت سے میرا دل تیزی سے دھڑک اُٹھا۔ میں نے پہلا سوال کیا۔

"۲۶ جولائی کو محترم ابنِ صفی کی پہلی برسی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے جذبات کیا ہیں؟"

"ایک سال گزر گیا۔ گزارتے ہوئے یہ سال پوری ایک صدی پر محیط محسوس ہوا تھا لیکن اب یوں لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے یہ حادثہ ابھی ابھی پیش آیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اُن پر جو نمبر شائع کر رہے ہیں، وہ معیاری اور جامع ہو۔"

"ابنِ صفی صاحب سے آپ کی رفاقت کتنے عرصے رہی؟"

"یہ تو ابدی رفاقت کا رشتہ ہے، مشتاق میاں!... لیکن دُنیاوی اعتبار سے آپ ستائیس سال کہہ سکتے ہیں۔"

"آپ نے محترم ابنِ صفی کی کتنی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے؟ ساری تحریریں پڑھی ہیں یا کچھ باقی ہیں؟"

"میں نے ان کی ایک ایک سطر پڑھی ہے۔ الحمد للہ مجھے ان کی تحریر کی اتنی پہچان ہے کہ آپ کتنی ہی مختلف تحریروں میں ان کا کوئی جملہ ملا کر میرے سامنے رکھ دیں تو بھی میں اسے شناخت کر لوں گی۔"

"آپ نے ان کی تحریروں کو اس وقت بھی پڑھا ہو گا جب آپ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ ان کے فن میں نکھار شادی کے بعد آیا... یا شادی سے پہلے ہی ان کا فن نکھرا ہوا تھا؟"

"اسرار صاحب کی تحریریں میں شادی سے قبل "نکہت" میں پڑھتی رہی ہوں۔ ابنِ صفی رشتے میں میرے پھوپھا کے صاحبزادے بھی تھے۔ اتنی قریبی عزیزداری کی وجہ سے ان کے گھرانے سے ہمارا تعلق خاصا گہرا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ پیدائشی فن کار تھے۔ بقول ان کے والد صاحب (جن کو ہم سب ابا پکارتے تھے) کے، 'اسرار قلم لے کر پیدا ہوئے تھے۔ حالات و واقعات کی تپش اور شدت سے ان کی تحریر میں پختگی آتی گئی۔'"

یہ طویل جواب دیتے ہوئے وہ خاموش ہو گئیں جیسے ماضی کی کسی گہری سوچ میں کھو گئی ہوں... پھر خود ہی چونک کر بولیں "جی... آپ کچھ پوچھ رہے تھے؟"

"آپ ان کی تحریروں میں کس حد تک معاونت کیا کرتی تھیں؟ کیا ناول لکھنے سے پہلے وہ کبھی آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے؟"

"ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ از خود لکھتے تھے۔ اگر لکھنے کے دوران میں کبھی کوئی اُلجھن ہوتی تو وہ لکھنا ترک کر کے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو جاتے۔ بعض اوقات باتوں کے دوران میں ان کا لکھنا بھی جاری رہتا۔ اگر کبھی لکھتے وقت کوئی دشواری پیش آجاتی تو مسودے کے کنارے، لاشعوری طور پر کوئی چہرہ، آنکھ یا ناک کی تصویر بنایا کرتے۔ جب ان کا ذہن کہانی کی طرف مائل ہوتا تو پھر لکھنا شروع کر دیتے۔ وہ آنکھ، ناک یا چہرہ نامکمل ہی رہتا۔"

"کبھی انہوں نے کوئی ناول شروع کرنے سے قبل آپ سے مشورہ کیا یا آپ کے مشورے پر کوئی ناول تحریر کیا؟"

"نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہاں البتہ 'آدمی کی جڑیں' کے متعلق تبادلہ خیال کرتے تھے لیکن بدقسمتی سے وہ مکمل نہ ہو سکا۔ میری شدید خواہش تھی کہ وہ مکمل ہو جاتا۔"

"کیا آپ نے کبھی ان کی ناول نویسی یا شاعری پر کوئی اعتراض کیا جو آپ کو ناگوار گزری ہو؟"

"ناول نویسی پر مجھے کبھی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ مجھے خود بے حد شوق تھا کہ جاسوسی دنیا یا عمران سیریز کا ناول مکمل ہو تو پڑھنے کو ملے... رہا شاعری کا مسئلہ تو شاعر ہر قسم کی بات کہتا ہے۔ وہ جیسا محسوس کرتا ہے، ویسا ہی اپنے کلام میں اظہار کرتا ہے۔ اس لیے مجھے ان کی شاعری پر کبھی اعتراض نہیں ہوا۔"

"یہ بتائیں کہ انہیں آپ نے بحیثیت شوہر کیسا پایا اور یہ بھی کہ بچوں کے لیے وہ کیسے باپ تھے۔ شفیق، جابر، یا بے پروا؟"

میرے اس سوال پر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ذرا بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئیں۔ شاید میرے سوال نے محترم ابنِ صفی کی کمی کا احساس شدید کر دیا تھا۔

"میرے خیال میں ابنِ صفی صاحب نہ صرف ایک بہترین شوہر تھے بلکہ بچوں کے آئیڈیل باپ بھی تھے۔ تمام بچے ان سے خوب کھل کر محبت سے بات کیا کرتے تھے بالکل دوستوں کی مانند۔ وہ بڑی محبت اور توجہ سے ہر ایک کی باتیں سنا کرتے تھے۔"

"کبھی کسی مسئلے پر اُن سے اختلاف رائے بھی رہا ہو گا؟"

"چھوٹی موٹی باتیں تو ہر گھر میں ہوتی رہتی ہیں۔ میرے خیال میں چھوٹے موٹے جھگڑے، محبت و یگانگت کی علامت ہوتے ہیں۔"

"ابنِ صفی صاحب کا اپنے والدین کے ساتھ سلوک کیسا رہا؟"

"وہ اپنے والدین کے نہایت فرمانبردار بیٹے تھے، اور اکلوتے ہونے کے ناتے بہت ہی زیادہ چہیتے بھی تھے اس کے باوجود والدین کے معاملے میں وہ بے حد ذمے دار تھے۔

[illegible] کے انتقال کے بعد والدہ کا بہت ہی زیادہ خیال رکھتے تھے؟"

"ابنِ صفی صاحب کا اپنے دیگر عزیز و اقارب سے سلوک [illegible] تھا؟"

"جس طرح وہ اپنے قارئین میں بحیثیت ایک مصنّف و [illegible] کے مقبول تھے اسی طرح خاندان بھر میں وہ ایک ہر دلعزیز [illegible] تھے۔ میری تمام بہنیں اور بھائی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔"

"ابنِ صفی صاحب اکثر آپ کی تعریف کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آپ بچوں کے لیے ایک مثالی ماں ہیں اور بچوں کی [illegible] داریوں سے انہیں آزاد کر رکھا ہے۔ کیا واقعی آپ نے بچوں کی طرف سے انہیں آزاد کر رکھا تھا؟"

"مصنف اور شاعر ایک حسّاس دل کا مالک ہوتا ہے اس لیے میں گھریلو ذمّے داریوں کو زیادہ تر اپنی ذات تک محدود رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ جہاں تک میرے مثالی ماں ہونے کا تعلق ہے تو ایک مشرقی عورت کی حیثیت سے میں بھرپور کوشش کر رہی ہوں کہ میرے بچے معاشرے کے بہترین افراد بنیں اور اپنے والد کی طرح ملک و قوم کا بہترین سرمایہ ثابت ہوں۔"

"صفی صاحب کے بعد بچّوں کی ذمّے داری آپ پر آن پڑی ہے اس سلسلے میں آپ کو کسی قسم کی دشواری یا کوئی اُلجھن تو درپیش نہیں؟"

"ظاہر ہے! ان کی غیر موجودگی سے شدید اُلجھن اور دشواری محسوس ہوتی ہے گو کہ بچّے سمجھ دار ہیں پھر بھی بہت سے مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ میں اکثر پریشان ہو جاتی ہوں۔ ان کی موجودگی میرے اور بچّوں کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ میں مطمئن رہتی تھی، چاہے وہ کسی معاملے میں مداخلت کریں یا نہ کریں۔"

"آپ نے بحیثیت بیوی کے انہیں انتہائی قریب سے دیکھا۔ کیا آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گی کہ اُن کی تحریر اور شخصیت میں کس قدر تضاد تھا؟"

"وہ اپنا کام آپ کرنا پسند کرتے تھے۔ ہر دُکھ و پریشانی کے وقت لوگوں کے کام آنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بعض اوقات ایسے معاملات میں وہ دھوکا بھی کھا جاتے اور خاصا نقصان اٹھاتے تھے۔ جب کوئی بات ان کی طبیعت کے خلاف ہو جاتی تو وہ اُسے اللہ کی رضا جان کر صبر کر لیا کرتے تھے۔ وہ اس بات سے خاصے دل برداشتہ ہوتے تھے جب لوگ ان کے نام کو مختلف انداز میں ناجائز استعمال کرتے... یا ان کے ملتے جلتے ناموں سے ناولیں لکھتے۔ بعض دفعہ ان کا کوئی نقّال اپنے ضمیر کے بوجھ سے مجبور ہو کر ان کے پاس آتا تو وہ خلوصِ دل سے اُسے معاف بھی کر دیتے تھے۔ اپنی تحریروں میں انہوں نے جتنے اچھے اور مثالی کردار پیش کیے ہیں، ان میں سے بیشتر اچھی عادتیں خود ان میں بھی پائی جاتی تھیں۔ شاید اسی لیے کسی نے کہا ہے کہ تحریر شخصیت کا آئینہ دار ہوتی ہے۔"

آپ کو ابنِ صفی کی کون سی تحریر سب سے زیادہ پسند ہے؟

"یوں تو مجھے ان کی تمام تحریریں بے حد پسند ہیں۔ خاص کر ناول تو سارے ہی بے مثال ہیں۔ ہاں! غزلوں میں ان کی فلمی غزل ؎

بن گئی بات... غبارِ کارواں ہے اور میں ہوں

اور ان کی دوسری غزل ؎

اپنی ذات سے عشق ہے سچا... باقی سب افسانے ہیں

مجھے یہ دونوں غزلیں بے حد پسند ہیں۔

ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ جمعے کی نماز کے لیے مؤذن نے صدائے اذان بلند کی۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے، آپ سے بہت کم باتیں کرنے کا موقع ملا۔ بہرحال، انشا اللہ کسی وقت تفصیلی انٹرویو کے لیے حاضر ہوں گا۔"

میں ان سے اجازت لے کر باہر آگیا۔ دفتر پہنچے اور پھر نماز کی جلدی تھی اس لیے انٹرویو بے حد مختصر رہا... لیکن مطمئن تھا۔ ایڈیٹر صاحب کی غصیلی نگاہ سے تو محفوظ رہوں گا۔ دیکھ لیجئے، پبلشر ہونے کے باوجود ایڈیٹر سے ڈرتا ہوں۔ ... وہ جو محترم ابنِ صفی صاحب نے کہا تھا: "مشتاق میاں! اظہر کا خیال رکھا کرو"... اور بھلا کیا خیال رکھوں؟

شکرال کی سرزمین کا ایک قصہ جس میں ابنِ صفی کے مقبول کردار ایرج اور عفرب اپنی تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

سحر کھوپڑی

ابنِ صفی

گلترنگ کا میلہ شکرال میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شکرال کی ساری بستیوں کے باشندے

سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے یہاں آتے ہیں اور پندرہ دِنوں تک مختلف قِسم کی رنگ رلیاں جاری رہتی ہیں۔ گلترنگ کے علاقے سے زیادہ پُر فضا مقام سارے شکرال میں کوئی دوسرا نہیں۔ اسے تو بس گلاب کا جنگل ہی کہنا چاہیے۔ پہاڑیاں خشک اور آنکھوں میں درد پیدا کر دینے والی نہیں ہیں۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے چشمے پھوٹتے ہیں اور ان کا شفاف پانی گلاب کی جھاڑیوں کے گِرد پتلی پتلی نالیوں میں بہتا پھرتا ہے۔ بعض جگہ کے پانی سے تو تازہ گلاب کی مہک آتی ہے۔

یہاں ایک زیارت گاہ بھی ہے اور یہ میلہ یادگار کے طور پر منعقد ہوتا ہے۔ شکرال کے ہر حصے کے لوگ جوق در جوق یہاں آتے ہیں۔ گلاب کی جھاڑیوں کے درمیان جگہ جگہ خیمے نصب کیے جانے لگتے ہیں اور سارا بَن آوازوں سے گونج اُٹھتا ہے۔ دُکانیں سجتی ہیں اور خیموں میں کزک (ہوٹل قِسم کی تفریح گاہ جہاں شراب بھی فروخت ہوتی ہے اور ناچنے والی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں) جمائے جاتے ہیں۔ جدھر بھی نظر اُٹھاؤ، بھانت بھانت کے اکھاڑے نظر آئیں گے۔ کہیں کُشتی ہو رہی ہے۔ کہیں گھونسہ بازی۔ کہیں تلوار کی کاٹ کے جوہر دِکھائے جا رہے ہیں اور کہیں رائفل اور پستول سے نشانہ بازی کے مظاہرے۔ رقص و سرود کی محفلوں کا کیا پوچھنا۔ سال میں شاید یہی پندرہ دِن بے فکری کے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ہر طرف راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔ . . پھر شاید ہی کوئی ایسا سال جاتا ہو جب یہاں خون کی ہولی بھی نہ ہوتی ہو۔ چشموں کے شفاف پانی میں سُرخ دھاریاں نظر آنے لگتی ہیں۔ گلاب کراہتے ہیں اور خوشبوئیں روتی پھرتی ہیں۔ . .

اگر ایک ہی بستی کے دو فریق ٹکراتے ہیں تو بات زیادہ نہیں بڑھتی۔ آگ تو اس وقت لگتی ہے جب دو مختلف بستیوں کے افراد کا ٹکراؤ ہو جائے۔ گلترنگ، لہو ترنگ بن جاتا ہے اور ساری بستیاں سرگرم کارزار ہو جاتی ہیں۔ کسی نے ایک بستی کا ساتھ دیا، کسی نے دوسری کا۔ . . جتنی دیر میں زیارت کا درویش اپنے حجرے سے باہر آتا ہے سینکڑوں لاشیں گر جاتی ہیں لیکن

آگ جس تیزی سے بھڑکتی ہے، اسی تیزی سے سرد بھی ہو جاتی ہے۔ . . . جہاں درویش کے خدام نے نیزوں پر کٹالیاں (مقدس نشان) بلند کیں اور درویش کے نام کے نعرے لگائے۔ اُٹھے ہوئے ہاتھ رُک جاتے ہیں۔ حملے ادھورے ہی رہ جاتے ہیں . . . پھر صرف تین چار گھنٹے تک تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ کوئی بڑا حادثہ ہو گیا ہو لیکن اس کے بعد وہی رنگ رلیاں، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

اس بار میلے کا پانچواں دِن تھا لیکن ابھی تک فضا چیخوں اور کراہوں سے نہیں گونجی تھی۔ گیتوں اور قہقہوں کے ساتھ گلاب کی لپٹیں رقص کرتی پھر رہی تھیں۔ رقاص لڑکیاں ناچ ناچ کر تھک جاتیں لیکن تماشائیوں کے مجمعے میں کمی نہ ہوتی۔ تیمال (ایک قِسم کی شراب جو مقامی غلّے بھورے دانے سے کشید کی جاتی ہے) کے دَور اس طرح چلتے ہیں جیسے آسمان سے برس رہی ہو۔ اس بار مقلاق کے اڈے پر بڑی رونق تھی لیکن یہ کسی سردار یا خان کا اڈہ نہیں تھا بلکہ ایک "خیرہ سر" کا ڈیرہ تھا۔

یہ خیرہ سر بھی عجیب ہوتے تھے۔ چھیڑ چھیڑ کر لڑنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا۔ خود ہی ایسے حالات پیدا کرتے کہ دوسرے بھی کٹ مرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ انہیں نہ اپنی بے عزتی کا ڈر ہوتا اور نہ دوسرے کی عزت کا پاس۔ سر ہتھیلی پر لیے پھرتے۔ لوٹ مار ذریعہ معاش ہوتا۔ ایسے لوگ تنہا نہیں ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ حرام خوروں کی خاصی بڑی بڑی بھیڑ بھی ہُوا کرتی تھی۔ اکثر یہ خیرہ سر بستیوں کے سرداروں سے بھی ٹکرا جایا کرتے۔ اس صورت میں یا وہ خود فنا ہو جاتے یا اسی کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے . . .

لیکن یہ مقلاقی خیرہ سر . . . اس سے شکرال کی ساری بستیوں کے سردار بھی خائف رہتے تھے کیوں کہ یہ چھ اُنگلیوں والا تھا۔ ایسے لوگ جو چھ اُنگلیاں رکھتے ہوں شکرال میں شنگشت (ہو سکتا ہے کہ یہ ششِ انگشت کا مخفف ہو) کہلاتے ہیں جس گھر میں کوئی چھ اُنگلیوں والا بچہ پیدا ہو جائے، اس کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ چھ اُنگلیوں والا بچہ عزت و توقیر، دولت اور امارت کا پیغامبر سمجھا جاتا ہے۔ انتہائی نحیف و زار ہونے کے باوجود بھی ایسا کوئی بچہ پورے شکرال میں حکومت کر سکتا ہے۔ لوگ اپنے ایسے بچوں کو عموماً درویش بناتے ہیں اور شکرال پر ان کا خون

حرام ہوتا ہے۔ کوئی انہیں قتل نہیں کرسکتا خواہ یہ کچھ بھی کرتے پھریں۔ ۔ لیکن یہ مقلاقی چھ اُنگلیوں والا۔ ۔ ۔ یہ درویش نہیں "خیرہ سر" تھا۔ شکرال کی تاریخ میں پہلا چھ اُنگلیوں والا جو امن کے بجائے فساد کا پیامبر سمجھا جاتا تھا۔ اس بار چونکہ یہ بھی میلے میں آیا تھا اس لیے کسی مقلاقی سردار نے یہاں آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ یہ ضیغم خیرہ سر ایسا ہی تھا کہ مقلاق کا خان بھی اس سے پناہ مانگتا تھا۔ اگر یہ غیر ذمے دار اور اوباش نہ ہوتا تو شاید مقلاق پر اسی کی حکمرانی ہوتی۔ طاقت ور بھی تھا اور اپنے ہی جیسے مصاحب بھی رکھتا تھا۔ بس دیوانوں کے ایک گروہ کا سردار تھا۔ مقلاق کے متمول لوگ اس کے خراج گزار ۔ ۔ ۔ تھے۔ خود مقلاق کے خان اعظم نے اس کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا مگر یہ صرف چھٹویں اُنگلی کی کرامت تھی ورنہ وہ کبھی کا مار ڈالا گیا ہوتا۔ شکرالیوں کے عقیدے کے مطابق شنگشت کی موت قحط اور وبائیں لاتی ہے، جس زمین پر اس کا خون گرتا ہے اس کی کھیتیاں ژالہ باری کی نذر ہو جاتی ہیں، جس ندی میں اسے غرق کیا جاتا ہے اس کا پانی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر یلغار کر دیتا ہے۔

اس بار میلے میں بڑے بڑے ہیکڑ سردار بھی اپنے خیموں سے نکلتے وقت یہ دیکھ لیتے تھے کہ ان کی چال ڈھال سے اکڑن تو نہیں ظاہر ہوتی۔ مقلاق کے علاوہ دوسری بستی والوں کو علم ہوتا کہ گلترنگ کے میلے میں ضیغم خیرہ سر بھی موجود ہوگا تو ان میں سے بہتیرے لوگ ادھر کا رُخ ہی نہ کرتے مگر اَب تو آہی پھنسے تھے مدت پوری کیے بغیر چلے جاتے تو زیارت گاہ کی توہین ہوتی۔ ادھر ضیغم کا یہ حال تھا کہ جس سردار کے ڈیرے کی کوئی رقاصہ پسند آجاتی اُسے بھری محفل سے کھینچ لے جاتا اور پھر وہ اسی کے ڈیرے پر رقص کرتی نظر آتی۔ سردار اور اس کے مصاحب دم بخود رہ جاتے۔ بس دِل ہی دِل میں پیچ و تاب کھایا کرتے۔

پچھلے ہی دِنوں سرخسان کے سردار شرجیل کے ڈیرے میں اسے غیر ملکی شراب کی چند بوتلیں دِکھائی دے گئیں باز کی طرح جھپٹا تھا۔ کچھ بولا نہیں تھا لیکن آج صبح پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا جب وہ اس کے ڈیرے کی رقاصہ کو بھی اُٹھالے گیا۔ اس نے بڑے غصے کے عالم میں تلوار کھینچ لی تھی لیکن اس کے ایک مصاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ضیغم نے وحشیانہ قہقہہ لگایا۔

"ہاں۔ آؤ۔ آؤ۔"

۔ ۔ لیکن پھر شرجیل کو بھی ہوش آگیا اور وہ اپنے خیمے کی طرف مڑتا ہوا بڑبڑایا ۔ ۔ ۔ "اچھا، اب تجھے کسی شنگشت ہی سے قتل کراؤں گا۔ رچھنی کے بچے۔" آواز دھیمی تھی اس لیے اس کا یہ عہد اس کے کسی مصاحب کے علم میں بھی نہ آسکا۔

شرجیل کچھ دیر بعد زیارت گاہ میں نظر آیا۔ وہ یہاں پر ضیغم خیرہ سر کی شکایت لے کر آیا تھا۔

"مقدس درویش۔" اس نے زیارت گاہ کے سب سے بڑے عابد کو مخاطب کیا۔ "میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کسی بد کار ۔ ۔ ۔ شنگشت کے ہاتھوں ہم کب تک ذلتیں اُٹھاتے رہیں گے۔"

درویش نے اپنے عصا کے سرے پر لگی ہُوئی کٹالی پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے شرجیل کو غور سے دیکھا اور پھر بولا۔ "تیری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"شنگشت امن کے پیغامبر ہوتے ہیں، مقدس درویش لیکن آخر یہ ضیغم خیرہ سر کب تک اپنی چھٹویں اُنگلی سے ہماری مونچھیں اُکھاڑتا رہے گا۔"

"ربّ عظیم کی مرضی۔" درویش نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ ہم پر عذاب نازل ہُوا ہے۔ تم جانتے ہو مقلاق کا خان اعظم بھی اس کا خراج گزار ہے۔"

"اگر کوئی شنگشت ہی اسے قتل کر دے تو۔" شرجیل نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

"کیا بک رہے ہو۔" درویش نے تحیر آمیز غصیلے لہجے میں کہا۔ "پورے شکرال میں اس بدبخت کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا شنگشت نہیں مِل سکے گا جو کسی کا خون بہا سکے۔"

"اچھی بات ہے۔" شرجیل نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ شنگشتوں پر پاک روحوں کا سایہ ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شنگشت کسی دوسرے شنگشت کا خون بہا دے تو کیا ہوگا، مقدس درویش؟"

"کچھ بھی نہیں ہوگا مگر ایسا ہونے کیوں لگا۔ شنگشت درویش ہوتے ہیں اور کوئی درویش اپنے ہاتھوں کسی چیونٹی کی موت بھی پسند نہیں کرسکتا۔"

"میں سمجھ گیا۔" شرجیل نے سر ہلا کر کہا۔ "کوئی شنگشت خون نہیں بہا سکتا لیکن اگر وہ کسی دوسرے شنگشت کو قتل کر دے تو وبائیں نہیں آئیں گی۔ قحط نہیں پڑے گا۔ ژالہ باری نہیں ہوگی۔ دریا پہاڑ پر نہیں چڑھ دوڑیں گے۔"

"ہاں یہی بات ہے۔" زیارت گاہ کے سب سے بڑے عابد نے آہستہ سے کہا تھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

★★ "او عیار۔ او ناہنجار۔ ادھر کہاں۔" ایرج دھاڑا لیکن عقرب اپنا تیز رفتار گھوڑا گلترنگ کی راہ پر ڈال چکا تھا۔ وہ سب سے آگے تھا۔ آٹھ نوجوان کملاکیوں کی ٹولی شکار کے لیے نکلی تھی۔ خیال تھا کہ کوہ ابیض کی ترائی میں جنگلی مینڈھے پکڑے جائیں ... تجویز بھی عقرب ہی کی تھی۔

"دیکھو۔ اَب دیکھو اس خنزیر کو۔" ایرج نے دوسروں سے کہا۔ "چلنے سے پہلے کیسی باتیں بنائی تھیں اور اب بھاگا جا رہا ہے گلترنگ کی طرف۔"

"ارے تو کون سی مصیبت آگئی۔" ایک ساتھی بول پڑا۔ "تم نے گلترنگ نہ جانے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

"اس خبیث نے مجھے دھوکا کیوں دیا؟" ایرج نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"ارے بس بھی کرو پیارے۔ ایک بار تو گلترنگ کی زیارت کرلو۔"

"سینکڑوں بار زیارت کر چکا ہُوں۔" ایرج بولا۔ "لیکن میلے کے زمانے میں نہیں، مجھے نفرت ہے میلے سے۔"

"کیوں پیارے اکڑو۔"

"سرداروں کی مونچھیں وہاں چھوکریوں کی زلفوں سے بھی زیادہ حقیر ہو جاتی ہیں۔ اتنی پی لیتے ہیں کہ ہوش ہی نہیں رہتا۔ ایک بار میں نے ایک سردار کی ذلت دیکھی تھی اور ایک شریر سی چھوکری اس کی مونچھ پکڑے ساری محفل میں نچاتی پھر رہی تھی۔"

"اوئے یار! شاید اسی لیے تو مونچھ رکھتا ہی نہیں۔"

ایرج کچھ نہ بولا۔ گھوڑے دوڑتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے عقرب کو جالیا۔

ایرج نے اس کی گردن دبوچنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ ایک طرف جُھکتا ہُوا بولا۔ "ارے ارے۔ او اکڑو، ربّ عظیم تجھے عقل دے کوہ ابیض کے مینڈھے گلترنگ میں گلاب چرنے گئے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں تُو نے اچھا کیا کہ کملاک کی سرداری قبول نہ کی۔ ورنہ ہم سب سوکھے سوکھے دُنیا سے چلے جاتے۔ کملاک کی ساری لڑکیاں قتل کر دی جاتیں اور تُو مردوں سے کہتا کہ بچے بھی جنا کرو۔"

سارے ساتھیوں نے قہقہے لگائے اور عقرب نے ایک گیت شروع کر دیا۔

پہاڑیاں گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجتی رہیں۔ ۔ ۔ قہقہے، گیت اور عقرب کے چٹکلے۔

گلترنگ تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا۔ یک بیک انہیں اپنے گھوڑوں کو روکنا پڑا کیوں کہ سامنے والے دَرے سے کچھ لوگ بڑی بدحواسی کے عالم میں نکلتے دِکھائی دے رہے تھے پھر ایرج نے اپنا گھوڑا آگے بڑھایا۔ ان لوگوں نے کچھ زخمی بھی تھے "کیا بات ہے، تم لوگ کون ہو؟" ایرج نے پوچھا۔

وہ رُک گئے لیکن اس طرح مُڑ مُڑ کر دیکھ رہے تھے، جیسے کوئی ان کا تعاقب کرتا رہا ہو۔

"قہر ۔ ۔ قہر۔" ایک بوڑھا آدمی ہانپتا ہُوا بولا۔ "ربّ عظیم کا قہر شیطان صفت شنگشت۔"

"پہلے تم اپنی سانسیں دُرست کرلو۔" ایرج نے نرم لہجے میں کہا۔

دوسرے آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ہمیں ضیغم خیرہ سر کے ہاتھوں بڑی ذلت نصیب ہُوئی ہے۔ کاش وہ والد الحرام شنگشت نہ ہوتا۔ اس نے ہمیں لوٹ لیا۔"

"کہاں؟"

"میلے میں۔ وہ اس بار قہر بن کر نازل ہُوا ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ وہ بھی آئے گا تو کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرتے۔"

"کیا وہ تمہارا تعاقب کر رہا ہے؟"

"اب پتہ نہیں۔ کچھ دُور تک تو اس کے کتوں نے ہمیں دوڑایا تھا۔"

"مقلاق کا کوئی سردار نہیں آیا کیا؟"

"کون آتا، کوئی بھی نہیں۔ کل تو اس نے سرخسان کے سردار شرجیل کو بھی بے عزت کیا تھا۔ اس کی قیمتی شراب چھین لے گیا تھا۔ ڈیرے سے ایک رقاصہ کو اُٹھا لیا۔"

پھر وہ لوگ آگے بڑھتے چلے گئے لیکن ایرج کا گھوڑا

وہیں جم گیا تھا۔ عقرب نے کہا۔ "چلو بھائی کیا سوچنے لگے۔ . . اچھا سمجھ گیا۔ چچا شرجیل کی فکر ستا رہی ہوگی۔"

"میں گلتر نگ نہیں جاؤں گا۔" ایرج نے کہا۔

"ارے واہ۔" عقرب ہاتھ نچا کر بولا۔ "گویا یہ اتنی تھکن مفت ہی سر پڑے گی۔ کیوں نہ جاؤ گے۔"

"وہ خیرہ سر!"

"ڈر گئے؟" عقرب نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں لیکن میں اس کا خون کیسے بہا سکوں گا۔ کاش وہ شنگشت نہ ہوتا۔"

چلو، چلو۔ ہوگا شنگشت ونگشت۔ میں ان چیزوں کو نہیں مانتا۔ میرا داؤ چل گیا تو کسی بیوہ کی طرح سر پیٹتا ہوا دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔"

"اوہ تو تم ربِ عظیم سے بغاوت کرو گے؟" ایرج نے آنکھیں نکالیں۔

عقرب نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "تم جانتے ہو کہ بچپن سے میں کراغال کے خان عیسیٰ کی ملازمت میں تھا۔ کیا آدمی تھا، وہ بھی۔ اس نے مجھے بڑی چالاکیاں سکھائی تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ربِ عظیم کا نام لینے والے عموماً ربِ عظیم کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ شنگشت والی ہوا بھی کسی مکار شنگشت ہی نے اُڑائی ہو گی۔ میرے ہوش میں تو کبھی کوئی شنگشت قتل نہیں ہوا کہ میں وبائیں اور قحط دیکھ سکتا۔ ژالہ باری تو یوں بھی ہوتی ہی رہتی ہے چاہے کسی شنگشت کو مارو چاہے نہ مارو۔"

"چپ رہو، خبیث! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" ایرج نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا۔

"اچھا بیٹا اگڑو۔ اگر اس خیرہ سر کو تمھارے ہی ہاتھوں قتل نہ کرایا تو کچھ بھی نہ کیا۔ بزدل کہیں کے۔ نام سُنا ضیغم کا اور دم نکل گیا۔ ابے اب تم سر پر ریشمی رومال باندھنا شروع کر دو، ہاں!"

"بہت ماروں گا اگر زبان چلائی۔" ایرج نے گھونسہ دکھایا۔

"ہاں، مجھ جیسے کمزوروں ہی پر تو ہاتھ اُٹھے گا تمھارا۔ . . ابھی کیا ہے۔ چھوکریوں کا قتلِ عام کر کے رستم کہلانا۔ شاباش۔"

"ارے چلو یار، ایرج۔" ایک ساتھی ہاتھ ہلا کر بولا۔ "ذرا دیکھیں تو آخر یہ خیرہ سر ہے کیسا۔ صرف نام ہی سُنا ہے۔"

"نہیں یہ خفا ہو گئے ہیں اس سے۔" عقرب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اب اس ناہنجار کی شکل نہیں دیکھیں گے۔ چچا شرجیل کی بڑی توہین کی تھی اس نے۔ بکری کی مینگنیاں (بیوہ عورتیں بکری کی مینگنیاں اُچھال کر اپنے شوہروں کے قاتلوں کو بددُعا دیا کرتی ہیں۔ یہ ایک تعزیتی رسم ہے) اُچھالیں گے اور بددُعائیں دیں گے اس صورت حرام کو۔"

"او عقرب، او عقرب۔" ایرج دانت پیستا ہوا زمین پر پہلو بدلنے لگا۔

▣

میلے کا ساتواں دن تھا۔ ہر طرف قہقہے اُبل رہے تھے۔ عام آدمیوں کو ضیغم خیرہ سر کی کیا پروا، وہ تو اس کے کارنامے سُن کر کبھی کبھی بغلیں بھی بجاتے تھے۔ مثلاً آج ہی جب اس نے ایک رہبانی سردار غرتاش کے ڈیرے میں ہنگامہ برپا کیا تھا، عام رہبانیوں نے بڑے پُرمسرت انداز میں ایک دوسرے سے اس کا تذکرہ کیا تھا۔ عام رہبانی اس سے نفرت کرتے تھے۔ طاقت ور بھی تھا اور اپنے ساتھ بہترین لڑاکے رکھتا تھا لیکن ضیغم خیرہ سر کا کیا بگاڑ لیتا جو شنگشت بھی تھا۔

اس کے بعد اس نے ایک سردار کے چائے کے ذخیرے پر ہاتھ صاف کیا اور قہقہے لگاتا ہوا واپس ہو رہا تھا کہ اچانک کسی نے پشت سے اس کی کھوپڑی پر اس زور کا ہاتھ رسید کیا کہ بڑے بالوں والی ٹوپی دُور جا گری۔

وہ دھاڑتا ہوا پلٹا۔ چپت جھاڑنے والا چھلانگیں مارتا ہوا ایک طرف دوڑتا جا رہا تھا۔ آس پاس کے لوگوں نے قہقہے لگائے۔ ضیغم پاگلوں کی طرح چیختا ہوا چپت مارنے والے کے پیچھے دوڑا لیکن اتنی دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

. . . پھر پُورے میلے میں بھونچال سا آ گیا۔ ضیغم اس دلیر کی شکل تو نہیں دیکھ سکا تھا جس نے یہ حرکت کی تھی لیکن اس کا اندازہ تھا کہ وہ کوئی نوجوان ہی ہو گا۔ بس اسے نئی سُوجھی۔ . . چرمی کا ایک چابک لے کر اپنے ڈیرے سے نکل آیا۔ جہاں بھی کوئی رقاصہ ملتی اس پر چابکوں کی بارش کر دیتا۔ "بول حرامزادی وہ کون تھا جس نے میرے سر پر ہاتھ مارا تھا۔" وہ اسے چابک مارتا ہوا پوچھتا۔ لڑکی بلبلاتی ہوئی زمین پر ڈھیر ہو جاتی۔

رقاصہ لڑکیاں چھپتی پھر رہی تھیں۔ بہتوں کو تو اس نے خیموں سے کھینچ کھینچ کر پیٹا تھا۔

لوگ دیکھ رہے تھے اور تاؤ کھا رہے تھے مگر شنگشت پر کون ہاتھ اُٹھاتا پھر وہ سب اس آدمی کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے جس نے اس کے سر پر چپت ماری تھی کیوں کہ اس سب افراتفری یا آسمانی قہر کی ذمے داری اسی شخص پر تھی مگر وہ تھا کہ ربِ عظیم کے قہر سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ چاروں طرف ... پھیل گئی۔

▣

ایرج اور اس کے ساتھی اپنے ساتھ خیمے وغیرہ تو لائے نہیں تھے۔ اس لیے انہیں پہاڑیوں میں ایک اچھا سا غار تلاش کرنا پڑا تھا۔ ایسا جس میں وہ اطمینان سے قیام بھی کر لیتے . . . اور اپنے گھوڑے بھی باندھ سکتے۔ ایرج ان لوگوں کے ساتھ چلا آیا تھا لیکن ابھی تک اس نے میلے کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ عقرب سویرے سے ہی غائب تھا۔ رہے دوسرے چھ ساتھی، تو کچھ غار ہی میں رہے تھے اور کچھ میلے میں گشت کرتے پھر رہے تھے۔ اس وقت ایرج بھی غار سے نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک ساتھی بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا۔

"غضب ہو گیا اگڑو۔" وہ ہانپتا ہوا بولا۔ "عقرب نے قیامت برپا کر دی۔"

"کیا ہوا؟"

"بھرے میلے میں ضیغم کے سر پر چپت مار کر بھاگ گیا۔"

"سچ مچ۔" ایرج نے قہقہہ لگایا۔ بے تحاشا ہنستا رہا۔

"سنو تو، سنو بھی۔ خاموش رہو۔" ساتھی جھنجلا گیا۔

"کیا ہے۔" ایرج پیٹ دبائے ہنسی روکنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

"ضیغم نے پورے میلے میں غدر برپا کر دیا ہے۔ بے چاری رقاصہ لڑکیوں پر چابک برساتا پھر رہا ہے۔ عقرب اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ کوئی منچلا ہو گا جسے کوئی نہ کوئی رقاصہ ضرور جانتی ہو گی اور اس کے شکاری کتے عقرب کو پہاڑیوں میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اگر اِدھر آ نکلے تو ہم مشکل ہی سے پیچھا چھڑا سکیں گے۔"

ایرج سنجیدہ ہو گیا۔ "عقرب کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کدھر نکل گیا۔"

"چلو۔" وہ اپنی رائفل کی طرف جھپٹتا ہوا بولا۔ "اگر اسے چوٹ بھی آئی تو ربِ عظیم کی قسم میں اس خیرہ سر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا چاہے سارے شنگرال پر انگاروں کی بارش ہو جائے۔"

"ارے ٹھہرو۔ سُنو تو سہی۔" ساتھی بوکھلا کر بولا۔ "دوسرے لوگ بھی عقرب ہی کو گالیاں دے رہے ہیں۔ ہمارا ساتھ کوئی بھی نہ دے گا۔"

"بکواس، مجھے کسی کی بھی پروا نہیں ہے۔" ایرج رائفل کو کاندھے سے لٹکاتا ہوا بولا۔ "عقرب کی حفاظت کرنی ہے۔ پتہ نہیں اسے کیا سُوجھی تھی۔"

"دوسرے کہاں ہیں؟"

"میلے میں ہوں گے۔ آؤ۔"

"یار اگر انہوں نے ہمیں یہاں پہاڑیوں میں دیکھ لیا تو مصیبت ہی آ جائے گی کیوں کہ عقرب کی شکل کسی نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ دیکھتے بھی تو کیا۔ وہ تو بہروپ میں تھا۔"

"اس کے آدمی کدھر ہیں۔" ایرج نے پوچھا۔

"پانچ پانچ کی ٹولیوں میں چاروں طرف پھیل گئے ہیں۔" ساتھی بولا۔

"چلو فکر نہ کرو۔ دیکھیں گے۔" ایرج نے اسے غار کے دہانے کی طرف دھکیلتے ہُوئے کہا۔

باہر چاروں طرف سناٹا تھا۔

"یار اگڑو۔" ساتھی نے چاروں طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ "کہیں پٹوا نہ دینا۔"

"ابے کیوں مرا جا رہا ہے۔ چل کوئی ہمارے ماتھے پر لکھا ہے کہ ہمارے ہی کسی ساتھی نے اس والدالحرام کے دھپ رسید کی تھی مگر یار عقرب، خُدا سمجھے اس سے، یہ کیا سوجھی تھی اسے۔"

"کراغالی خان کی نوکری نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا۔" ساتھی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ہاں۔ آں۔ عقرب نے اس سے فرنگیوں کی سی عیاریاں اور مکاریاں سیکھی ہیں۔ کیسے کیسے بہروپ بھرتا ہے۔" ایرج بڑبڑایا۔ "مگر اسے یہ کیا سوجھی تھی۔ اس شیطان خنگشت کو کیوں چھیڑ بیٹھا۔"

وہ کچھ ہی دُور چلے ہوں گے کہ آواز آئی۔ "خبردار۔ ٹھہرو اپنے ہاتھ اُٹھا دو۔"

وہ آواز کی طرف مُڑے۔ ایک قریبی چٹان کے عقب سے پانچ رائفلیں نکل آئیں جن کے رُخ انہی کی جانب تھے۔ پانچ بدہئیت کراغالی، جو اپنے خیرہ سر سردار ہی کی طرح وحشی معلوم ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے نظر آئے۔

پھر وہ نصف دائرے کی شکل میں ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر رُکے۔ ایک نے کڑک کر کہا۔ "تم میں سے کون ہے جس نے طرغوس کے بیٹے پر ہاتھ اُٹھایا تھا؟"

"ہم نے تو ابھی تک کسی پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔" ایرج نے بے خوفی سے جواب دیا۔

البتہ اس کے ساتھی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اس نے بوکھلا کر کہا "ہم دونوں کملاکی ہیں بھائی، ہمارے ہاتھ اُٹھنا نہیں جانتے۔"

"تم چُپ رہو۔" ایرج آنکھیں نکال کر غرایا۔

"او ئے، ہمارے سامنے آواز اونچی کرتا ہے۔" وحشی نے اسے رائفل کا کُندا مارنا چاہا لیکن ایرج بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔

"مارو۔" وحشی دھاڑا اور دوسرے ہی لمحے میں بقیہ چار رائفلوں کے کُندے بھی بلند ہوئے تشکرالی عموماً اپنے کارتوس بہت احتیاط سے صرف کرتے تھے۔ اگر دشمن قریب ہو تو "دست بدست" جنگ ہی کو ترجیح دیتے ہیں اس میں عموماً رائفل کے کُندے چلتے یا پھر خنجر بازی ہوتی، کلہاڑی بھی استعمال کی جاتی۔

ایرج نے بھی رائفل کاندھے سے اُتار لی اور اس کا ساتھی بھی سنبھل گیا۔ وہ بھی بزدل تو نہیں تھا۔ بس بات صرف اتنی سی تھی کہ کملاکی عموماً صلح جوئی ہی کی طرف مائل رہتے تھے اگر دیکھتے کہ جھگڑے کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے تو یہی کوشش کرتے کہ جھگڑا نہ ہونے پائے۔

ادھر ضیغم نے میلے میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ درجنوں لڑکیاں اپنے خیموں میں پڑی سسک رہی تھیں۔ ان کے نازک جسموں پر بے شمار لمبے لمبے نیل تھے۔ دوسرے سردار پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ زیارت گاہ کے خُدام نیزوں پر کتالیاں بلند کیے ہوئے ربّ عظیم کے فرمان دُہراتے پھر رہے تھے لیکن یہ ضیغم خیرہ سر کا چابک تھا، کیسے رُک جاتا۔ اس وقت بھی وہ ایک لڑکی کو پیٹ رہا تھا۔ . . ٹھیک اسی وقت سب سے بڑے عابد کا ایک ایلچی اس کے پاس آیا۔ یہ ایلچی بھی شنگشت ہی تھا۔ بڑے عابد کا معتمدِ خاص . . .

"اے خیرہ سر۔" اس نے زیارت گاہ کے نشان کو جنبش دے کر کہا جو اس کے عصا کے سر پر نصب تھا "اے خیرہ سر! اِدھر دیکھ، میں بھی شنگشت ہی ہوں۔ تجھے بڑے عابد کی طرف سے حُکم دیتا ہوں کہ اپنے ہاتھ روک لے۔"

ضیغم نے ہاتھ روک کر ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا اور پھر لڑکی کو چابک رسید کر دیا جو تلملاتی اور چیختی ہوئی زمین سے اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو نہیں سُنتا۔" ایلچی نے کہا "اچھا تو دوسری بات سُن! ربّ عظیم کا فرمان سُن۔ اپنی تقدیر سُن۔ جس دن سر بازار تیری ٹوپی سر سے گرے گی، اس کے تیسرے دن تیری رُوح جسم سے نکل کر اس دلدل میں جا پھنسے گی جہاں پر گنہگاروں کی روحیں دن رات چیختی اور کراہتی رہتی ہیں۔"

"او۔ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔" ضیغم خیرہ سر نے جھلاہٹ میں اسے بھی ایک چابک رسید کر دیا۔

"ربّ عظیم کا نام اونچا۔" ایلچی اپنی جگہ سے ہٹے بغیر پُرسکون آواز میں بولا۔ "یہ بھی تقدیر ہی ہے، مجھے یقین ہے کہ تو آج کے تیسرے دن اسی دلدل میں جا پھنسے گا۔ ربّ عظیم۔ ربّ عظیم۔"

وہ زیارت گاہ کی طرف مُڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ "ربّ عظیم۔" دھیمے سُروں میں گنگناہٹ جاری تھی۔

ضیغم خیرہ سر حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے اس طرح رُخصت ہوتے دیکھ رہا تھا کہ لڑکی چُپ چاپ اُٹھی اور بے تحاشا ایک طرف دوڑتی چلی گئی لیکن ضیغم اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔

"ربّ عظیم . . . ربّ عظیم۔" ایلچی کی گنگناہٹ اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یک بیک اس نے جھرجھری سی لی اور کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس کر پاگلوں کی طرح قہقہہ لگایا۔

پھر اپنے آدمیوں کو آوازیں دینے لگا۔ دو چار جو قریب ہی تھے دوڑ کر آئے تھے۔

"ربّ عظیم کہاں ہے؟" اس نے گرج کر پوچھا اور وہ بوکھلا کر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔

"بتاؤ نا۔" ضیغم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں سردار۔" ایک گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے، پتہ نہیں، ٹھیک ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو بھی پتہ نہیں۔ جاؤ۔" اس نے کہا چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر ہاتھ اُٹھا کر بولا "ٹھہرو۔ اسے آج ہی مر جانا چاہیے۔"

"سردار . . . ابھی مار ڈالیں گے مگر کسے؟"

"ہر ایک کو مار ڈالو جس پر شبہ ہو جائے۔ جاؤ . . . جاؤ۔" وہ اتنے زور سے چیخا کہ گردن کی رگیں تک پھول گئیں۔

●

اس آدمی کی چیخ بڑی کربناک تھی جس کے سر پر ایرج کی رائفل کا کُندا پڑا تھا۔ وہ دوبارہ نہ اُٹھ سکا۔ دوسرے اس کا حشر دیکھ کر بُری طرح جھلا گئے اور پھر یہی محسوس ہونے لگا جیسے وہ ان دونوں کو بہرحال مار ڈالیں گے۔ رائفلیں لاٹھیوں کی طرح چلتی رہیں۔ کُندے ایک دوسرے سے ٹکرا کر آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ دفعتاً ایرج نے جُھکائی دے کر ایک اور کو ٹھکانے لگایا . . . باقی بچے ہیں۔ انہوں نے حلق پھاڑنا شروع کر دیا۔ "یہی [illegible] معلوم ہوتا ہے جس نے سردار کی توہین کی تھی۔ زندہ بچ کر نہ [illegible] پائے۔"

اب وہ دیوانہ وار حملے کر رہے تھے اور بُری طرح پٹ [illegible] پھر بیس منٹ تک یہ کھیل جاری رہا تھا لیکن آخری آدمی [illegible] نہیں دکھائی تھی۔ لڑتے ہی لڑتے گرا تھا اور بے ہوش [illegible]

"اکڑو۔ اب نکل چلو کسی طرف۔ اگر ان کی آوازیں . . ." [illegible] ساتھی رُک کر ہانپنے لگا۔

ایرج بھی ہانپ ہی رہا تھا لیکن چہرے سے تھکن نہیں ظاہر [illegible] بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے غصّے کی زیادتی کی وجہ سے [illegible] تیزی سے چلنے لگی ہو۔

"میلے میں جانا ٹھیک نہیں ہے۔" ایرج نے کچھ دیر بعد [illegible] "ہم یہیں آس پاس ہی رہ کر اپنے گھوڑوں اور سامان وغیرہ [illegible] حفاظت کریں گے۔ یہ عقرب کا بچّہ پتہ نہیں کہاں مر گیا۔ . . مارا [illegible] گا، ضرور مارا جائے گا یعقل ہی نہیں آتی گدھے کو۔"

وہ آس پاس ہی کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگے جہاں چھُپ [illegible] غار کی نگرانی کر سکتے۔

کامیابی جلد ہی ہوئی۔ یہ ایک غار تھا جس کے دہانے پر [illegible] چٹان اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ دہانہ تقریباً چھُپ کر ہی رہ [illegible] تھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ غار چھوٹا ہو گا لیکن اندر پہنچ کر محسوس ہوا [illegible] تو تقریباً سو ڈیڑھ سو آدمی بہ آسانی چھُپ سکتے ہیں . . . اندر [illegible] اندھیرا تھا۔

"کیا دوڑ کر غار سے ایک مشعل اُٹھا لاؤں؟" ساتھی نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرے تھیلے میں تیل کا ڈبّہ اور گولا موجود ہے۔" ایرج [illegible] کہا۔

کچھ دیر بعد غار میں روشنی بھی ہو گئی۔ کپڑے کا گولا تیل میں [illegible] کر روشن کر دیا گیا۔

"ن . . . نہیں۔ رحم کرو۔" ہلکی سی سسکی کے ساتھ کانپتی [illegible] سی آواز آئی اور ایرج اُچھل پڑا۔

"ارے یہ کون؟" ساتھی بھی آواز کی طرف مُڑا۔ بائیں جانب [illegible] بڑے پتھر سے کوئی چمٹا ہوا تھا۔ گولے کی روشنی اتنے بڑے [illegible] کے لیے ناکافی تھی۔ اس لیے اس کا چہرہ نہ دیکھا جا سکا گولا [illegible] پر پڑا ہوا جل رہا تھا۔

"خبردار، اپنی جگہ سے جنبش نہ کرنا۔" ایرج غرایا اور جھک کر روشن گولے کو خنجر کی نوک پر اُٹھا لیا۔ پتھر پر نظر آنے والا متحرک سایہ روشنی میں آ گیا۔ یہ ایک خوف زدہ لڑکی تھی۔

"نہیں۔" وہ گڑگڑاتی ہوئی بولی۔ "ربّ عظیم کا واسطہ، مجھے ہاتھ نہ لگانا، میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے علم نہیں کہ وہ کون تھا۔ رحم کرو۔ رحم کرو۔ مجھے سردار ضیغم کے پاس نہ لے جاؤ۔"

"اوہ . . ." ایرج نے طویل سانس لی۔

"میں قسم کھا سکتی ہوں۔ کوئی بڑی قسم دو مجھے۔"

"ڈرو نہیں۔" ایرج نے نرم لہجے میں کہا۔ "تم ہمیں غلط سمجھی ہو۔ ہمارا اس خیرہ سر سے کوئی تعلق نہیں۔"

لڑکی کچھ نہ بولی وہ اب بھی کانپ رہی تھی۔

"یہاں تمھیں کون لایا ہے؟" ایرج کے ساتھی نے پوچھا۔

"مم . . . میں یہاں آ چھُپی ہوں۔ اس دیوانے نے کئی لڑکیوں کے چہرے بگاڑ دیے ہیں۔ کسی کو کیا پتہ کہ اس کے سر پر چپت مارنے والا کون تھا۔"

"تم اُدھر کا دھیان رکھو۔" ایرج نے ساتھی سے کہا اور وہ غار کے دہانے کی طرف چلا گیا۔

لڑکی کہہ رہی تھی "میں سرخسان سے آئی ہوں۔ سردار شرجیل کے ساتھ۔"

"ہوں۔ اچھا ڈرو نہیں، بیٹھ جاؤ۔ ہم تمھیں شرجیل کے ڈیرے تک پہنچا دیں گے۔"

"شش شش۔" غار کے دہانے کی طرف سے آواز آئی۔ غالباً ساتھی نے ایرج کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا۔ ایرج تیزی سے آواز کی جانب بڑھ گیا۔ باہر بے ہوش مقلاقیوں کے قریب کچھ لوگ نظر آئے۔ یہ بھی لباس سے مقلاقی معلوم ہوتے تھے۔ ہو سکتا ہے خیرہ سر کے ساتھیوں ہی میں سے رہے ہوں۔ یک بیک

ان میں سے ایک نے چیخ ماری اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ خون کی چادر اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ وہ آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی بوکھلا کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے پھر جیسے ہی وہ اس تازہ زخمی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان میں سے ایک نے پھر چیخ ماری اور وہ بھی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر بھی خون بہتا نظر آرہا تھا۔

پہلا زخمی جھومتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ وہ چاروں طرف دیکھنے لگے تھے۔ اتنے میں دوسرے نے بھی زمین پکڑ لی اور پھر وہ انتہائی سراسیمگی کے عالم میں ایک طرف بھاگ نکلے۔

"یہ کیا ہوا؟" ایرج کا ساتھی بڑبڑایا۔

"اس حرام خور کے علاوہ اور کون ہوگا۔" ایرج ہنس پڑا۔ "وہ قریب ہی کہیں موجود ہے۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

★★

سردار شرجیل کے ڈیرے میں رجبانی سردار بھی موجود تھا۔ دونوں قہقہے لگا رہے تھے پھر یک بیک رجبانی سردار سنجیدگی اختیار کر کے بولا۔ "اس والد الحرام نے بڑے عابد کے ایلچی پر بھی چابک سے حملہ کیا تھا۔ اب اگر اس کے ساتھیوں پر آسمان سے پتھر برسیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ربّ عظیم کی طاقت سے کون ٹکرائے گا۔"

"مگر وہ کون جیالا تھا سردار! جو اسے سرِ بازار رسوا کر گیا۔ سُنا ہے ٹوپی اُچھل کر دُور جا پڑی تھی۔"

"ربّ عظیم کا قہر جو چھلاوے کی شکل میں نازل ہوا تھا۔۔ بڑے عابد نے اپنے خصوصی خُدام کو بتایا ہے کہ ضیغم کا آخری وقت قریب ہے۔ وہ اس طرح مارا جائے گا کہ نہ تو اس کا ایک قطرہ خون بہے گا اور نہ وہ مرتے وقت زمین ہی پر ہوگا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔" شرجیل نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"اسی طرح جیسے آسمان سے پتھر برستے ہیں۔ انہوں نے پہاڑوں سے تین لاشیں اور چار زخمی اُٹھائے ہیں۔ پانچ کا حشر تو انہوں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا مگر دو آدمی تو ان کے سامنے ہی ڈھیر ہوئے تھے۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔ ربّ عظیم کا سایہ ہم پر رہے۔"

دفعتاً خیمے کے باہر سے چیخ پکار سُنائی دی۔ وہ چونک پڑے۔ رجبان کا سردار دَر کی طرف جھپٹا اور پھر بوکھلا کر پیچھے ہٹ آیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" شرجیل غرّایا۔

"وہ اِدھر ہی آرہا ہے۔"

"کون؟"

"ضیغم۔۔۔ خیرہ سر! خنزیر کا بچّہ۔"

ضیغم آندھی اور طوفان کی طرح خیمے میں داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چابک تھا اور دوسرے میں ریوالور۔۔۔ ریوالور کی نال انہی دونوں کی طرف تھی۔

"اچھّا، اچھّا۔" ضیغم دھاڑا۔ "یہ رجبان کا خرگوش یہاں ہے۔۔۔ کیوں بے! کیا وہ تیرا ہی آدمی نہیں تھا جس نے میری توہین کی تھی۔ میں اُس وقت تیرے ہی ڈیرے سے تو واپس ہوا تھا۔"

"ضیغم۔۔۔ ہوش میں آؤ۔ سرداروں سے اس طرح پیش نہیں آیا کرتے۔" شرجیل نے نرم لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ "تم کیسے شنگشت ہو۔"

"ابھی اور بُری طرح پیش آؤں گا۔" ضیغم نے قہقہہ لگایا۔ "تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میرے داہنے ہاتھ میں چابک ہے اور بائیں ہاتھ میں آگ اُگلنے والا چوہا۔ ہاہاہا۔۔۔ آ۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔"

"او۔۔۔ ربّ عظیم۔۔۔ میرے معبود۔" شرجیل دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "تو فیصلہ کر کہ میں کیا کروں۔ میں جو ضحاک کے شیطان صفت باپ کی کھوپڑی اپنے پیروں کے نیچے رکھتا تھا۔"

"ضحاک میرا دوست تھا۔" ضیغم حلق پھاڑ کر دھاڑا۔ "اس کا انتقام میں تم سے ضرور لوں گا۔ بہت اچھّا ہوا، تم نے خود ہی یاد دِلا دیا۔ میں تمھاری بوٹیاں نوچوں گا۔ چیل، کوّوں کو کھلاؤں گا۔ سِسکا سِسکا کر ماروں گا۔"

"ضحاک کو ایک کملا کی چھوکرے نے مارا تھا۔" رجبان کے سردار نے کہا۔

"تم چُپ رہو۔ میں تم سے بات نہیں کر رہا۔"

دفعتاً باہر سے آواز آئی۔ "سردار یہ رہی ایک اور لڑکی۔"

ضیغم جھپٹ کر باہر نکل گیا۔ شاید اُسی کے کسی آدمی کی آواز تھی۔۔۔ سامنے سے ایرج آتا ہوا دِکھائی دیا۔ اس کے ساتھ وہی لڑکی تھی جس سے اس نے شرجیل کے ڈیرے تک پہنچا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ضیغم غرّا کر اس کی طرف جھپٹا۔

"تو کہاں تھی؟ تیرے گالوں پر چابک کے نشان کیوں نہیں ہیں۔" وہ پاگلوں کی طرح دھاڑا۔

"پیچھے ہٹ۔" ایرج نے بائیں ہاتھ سے اس کا ریوالور چھینتے ہوئے سینے پر مُکّا مارا۔ وہ ضیغم کو پہچانتا نہیں تھا لیکن اس کے ہاتھ میں چابک دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ وہی ہوگا۔ ضیغم گھونسہ کھا کر پیچھے کسی زخمی شیر کی طرح دھاڑا تھا۔ اس کے آدمیوں نے ایرج پر جھپٹنے کی کوشش کی۔

"خبردار۔۔۔ کوئی آگے بڑھا تو جہنّم رسید کر دوں گا۔ یہ کون ہے جس نے میری ساتھی کی توہین کرنی چاہی تھی؟"

ضیغم کے ساتھی ٹھٹک گئے۔ آس پاس سنّاٹا چھا گیا۔ شرجیل خیمے کے دَر پر کھڑا متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکا رہا تھا۔

"تو مجھے نہیں جانتا۔ میں ہوں ضیغم خیرہ سر۔۔۔ ٹھہر تو سہی اگر تیری لاش میلے میں نہ گھسیٹوائی۔" ضیغم پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر چیخا۔

"اچھا تو تم خیرہ سر ہو۔" ایرج نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "مجھے بھی دیکھو۔ میں بھی ایک خیرہ سر ہوں۔ یہ بڑی اچھّی بات ہے کہ تم مل گئے۔ آؤ نکالو خنجر۔۔۔ دِل چاہے تو ریوالور ہی سنبھال لو۔ میں ہر طرح تیار ہوں۔"

"او نادان۔۔۔ او ناسمجھ لڑکے۔۔۔" شرجیل چیخا۔ "یہ شنگشت ہے۔ تُو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔"

"شنگشت۔" ایرج نے خواہ مخواہ متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں پھر ہنس پڑا۔ "نہیں، مجھے بہکانے کی کوشش نہ کرو۔ شنگشت خیرہ سر نہیں ہوتے۔ وہ تو دِن رات ربّ السمٰوات کے گیت گاتے رہتے ہیں۔"

"خاموش رہو۔" ضیغم ہاتھ ہلا کر چیخا۔ "ہاں میں شنگشت ہوں۔ دیکھو میرے دونوں ہاتھوں میں چھ چھ اُنگلیاں ہیں۔"

قریب ہی ایک مریل سا بوڑھا کھڑا تھا۔ یک بیک اس نے اُچھل کر اس کے سر پر اس زور کا ہاتھ رسید کیا کہ ایک بار پھر ٹوپی ہوا ہو گئی پھر تو ایسا شور اُٹھا کہ آس پاس کے مُردے بھی زیرِ زمین کروٹیں لینے لگے ہوں گے۔

اس میں قہقہے بھی شامل تھے اور ضیغم کی دھاڑیں بھی۔

اس کے آدمی جو پہلے تو بھونچکّے رہ گئے تھے اب اسی بوڑھے کے پیچھے دوڑے جا رہے تھے۔ اس بار تو ہر ایک نے اس کی شکل دیکھی تھی اور سنّاٹے میں آگئے تھے۔ وہ مریل سا بوڑھا جس کا جسم کمر کے جھکاؤ کی وجہ سے کمان ہو رہا تھا، بچوں سے بھی زیادہ پھرتیلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے رفوچکر ہو گیا تھا اور ضیغم کے آدمی محض دِکھاوے کے طور پر دوڑتے چلے گئے تھے پھر ضیغم بھی ایرج کو وہیں چھوڑ کر اُدھر ہی دوڑتا چلا گیا۔ اس بار تو اُسے اپنی ٹوپی اُٹھانے تک کا ہوش نہیں رہا تھا۔

قہقہے۔۔۔ قہقہے۔۔۔ چاروں طرف کے قہقہوں سے کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔ ایرج نے ضیغم کا ریوالور اپنے شکاری تھیلے میں ڈال لیا۔ لڑکی بھاگ کر شرجیل کے پاس جا پہنچی تھی۔ ایرج بھی آہستہ آہستہ خیمے کی طرف بڑھا۔ شرجیل نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ رجبان کا سردار اُسے گھورے جا رہا تھا۔

"تم کہاں تھے بیٹے؟ میں تو پہلے دن سے یہاں ہوں۔"

"بس یونہی نکل آیا تھا شکار کھیلتے ہوئے۔۔۔ یہ لڑکی خوف زدہ تھی۔ غار میں چھپ گئی تھی۔ اس نے آپ کا نام لیا میں نے کہا چلو پہنچا دوں۔"

"جاؤ۔۔۔ تم اندر جاؤ۔ اب باہر مت نکلنا۔" شرجیل نے لڑکی سے کہا پھر ایرج سے بولا۔ "شاید یہی ایک ایسی بچّی ہے جس کا چہرہ داغدار نہیں ہوا ورنہ اس حرامزادے نے تو۔۔۔"

"یہ کون ہیں؟" رجبان کے سردار نے بات کاٹ دی۔

"یہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ یہ میرا اپنا ہی بچّہ ہے۔ میرے ایک جگری دوست کا لڑکا۔"

"کیوں بیٹے! کیا تم نے پہلے کبھی اس خیرہ سر کا نام نہیں سُنا؟" رجبان کے سردار نے پوچھا۔

"نام سُنا تھا، شکل آج ہی دیکھی ہے۔" ایرج نے بے پروائی سے کہا۔

"اچھّا تو اب میلے سے رخصت ہو جاؤ۔ موقع ہے۔ اگر وہ واپس آگیا تو۔۔۔"

ایرج کے ہونٹوں پر خفیف سی مُسکراہٹ نظر آئی اور وہ شرجیل کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں بیٹے، سردار کا مشورہ بہت مناسب ہے۔"

"ہاں۔۔۔" ایرج نے طویل سانس لی۔ "لیکن میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ کتنا حقیر آدمی ہے۔ ایک کمزور سا بوڑھا بھرے مجمعے میں اسے چپت جھاڑ گیا۔"

"ارے۔ وہ تو ربّ عظیم کا قہر تھا۔ عذاب کا فرشتہ جو بوڑھے کے بہروپ میں آیا تھا اور چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ کیا تم نے سُنا نہیں کہ اس کے آدمیوں پر آسمان سے پتھر برستے ہیں۔"

ایرج کو ہنسی آگئی۔ عقرب کی مکّاریاں کیسے کیسے گُل کِھلا رہی تھیں۔ پورے شکرال میں اس سے بڑا عیار شاید ہی کوئی دوسرا نکل سکتا۔

"تم ہنس رہے ہو لڑکے۔" رجبان کے سردار کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ "تمھیں ربّ عظیم کی قدرت میں شبہ ہے کیا؟"

"نہیں معزز سردار! میں دوسری بات پر ہنس رہا تھا۔" ایرج

نے نرم لہجے میں کہا۔ "میرے لیے بھی ربِ عظیم کا یہی حکم ہے کہ کسی کو بھی پیٹھ نہ دکھاؤں۔"

"بچوں کی سی باتیں نہ کرو بیٹے! جاؤ یہاں سے ورنہ میں تم سے خفا ہو جاؤں گا۔" شرجیل نے کہا۔

"یا عَم! جیسی آپ کی مرضی۔" ایرج تیزی سے دوسری طرف مڑ گیا۔

شرجیل اسے جاتے دیکھتا رہا پھر جب وہ اگلی ڈھلان سے نیچے اُتر گیا تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خود بھی خیمے کے اندر چلا گیا۔

ڡ

ضیغم اپنے آدمیوں پر چابک برسا رہا تھا اور وہ چاروں طرف بھاگے پھر رہے تھے لیکن اتنی ہمت بھی نہیں رکھتے تھے کہ وہاں سے ہٹ ہی جاتے۔

یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ اگر کسی ایک پر غصہ آجاتا تو اس وقت وہاں موجود ہونے والوں میں سے کوئی بھی نہ بچتا۔ وہ چیختے رہتے اور پٹتے رہتے حتیٰ کہ ضیغم تھک کر خود ہی ہاتھ روک لیتا۔ میلے میں دوبارہ "ٹوپی" اچھل چکی تھی لیکن آج دوسرا دن بھی گزر جانے کے باوجود اس مسخرے کا پتہ نہیں لگ سکا۔ اس وقت اُسی کا غصہ اُتر رہا تھا۔

"او سردار۔۔" دفعتاً ایک ساتھی ہاتھ اُٹھا کر چیخا۔ "سن لو۔ میری بات سن لو۔ تم مجھے عقلمند سمجھتے ہوتا۔ بات سن لو پھر چاہے مار ہی ڈالنا۔ کالی دلدل میں تو بہر حال پھنسنا ہے۔"

"بول۔۔ جلدی بول۔" ضیغم اپنا چابک والا ہاتھ روکتا ہوا بولا۔

"وہ کوئی آدمی نہیں تھا۔"

"تو پھر کیا وہ سؤر تھا جس نے تیرے دادا کی قبر پر لوٹیں لگائی تھیں۔"

"نہیں، وہ شاید عذاب کا فرشتہ تھا۔ ہم پر آسمان سے پتھر برستے ہیں جب ہم اس کی تلاش میں نکلتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔" اس نے پھر چابک جھاڑ دیا۔ ساتھی تلملا کر پیچھے ہٹ گیا لیکن ضیغم کا ہاتھ دوبارہ نہیں اُٹھا تھا۔۔۔ دفعتاً وہ کسی سوچ میں پڑ گیا پھر کچھ دیر بعد بولا۔ "سب گدھے پن کی باتیں ہیں۔ کچھ بھی ہو اُسے تلاش کرو اور کھینچتے ہوئے میرے سامنے لاؤ۔ اس طرح گھسیٹو کہ یہاں پہنچتے پہنچتے اس کا سارا جسم چھلنی ہو جائے۔ اس سے نمٹنے کے بعد میں اس زیارت گاہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

"ارے باپ رے۔" پٹنے والے نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور اس طرح آنکھیں پھاڑنے لگا جیسے اُسے ضیغم کی بات پر یقین ہی نہ آرہا ہو۔

"سیدھا کھڑا رہ۔" ضیغم ہنکارا۔ "ہاں میں اس زیارت گاہ کو زمین کے برابر کر دوں گا۔ بڑے عابد کو اس طرح سسکا سسکا کر ماروں گا کہ عذاب کے فرشتے بھی رو پڑیں گے۔"

"سردار۔ سردار۔" کئی لرزتی ہوئی سی آوازیں احتجاجاً بلند ہوئیں۔ وہ بُرے لوگ ضرور تھے لیکن زیارت گاہ کے متعلق ایسی باتیں سن کر ان کے دل لرز گئے۔ ویسے بھی وہ ان آسمانی پتھروں سے بُری طرح خائف تھے جنہوں نے ان کے تین ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

"بڑا عابد میرے مستقبل کے بارے میں بُری خبریں پھیلا رہا ہے۔" ضیغم بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "میں بھی دیکھوں گا کس کا ہاتھ اُٹھتا ہے مجھ پر۔۔"

وہ پھر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے ساتھیوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ پٹتے وقت بھی ان کے چہروں پر اتنی سراسیمگی نہیں دکھائی دی تھی جتنی اب نظر آرہی تھی۔ زیارت گاہ کی توہین کے تصور سے ہی ان کے دل کانپ رہے تھے۔

ضیغم تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر یک بیک اچھل پڑا۔ "بڑے عابد پر میرے علاوہ اور کوئی نہ ہاتھ اُٹھا سکے گا کیونکہ وہ بھی ایک شنگشت ہے۔ ہاہا۔۔ ہاہا۔۔ ہاہا۔۔ ربِ عظیم نے مجھے پیدا کر کے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر نہ کرتا تو اس بڑے عابد کی عمر خواہ مخواہ بڑھتی رہتی۔ دیکھنا۔۔ تم سب لوگ دیکھنا۔۔"

ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ہونٹ خشک تھے اور حلق میں کانٹے پڑے جا رہے تھے۔

ڡ

غار میں الاؤ روشن تھا اور وہ سب اس کے گرد بیٹھے ہوئے کالی ٹکیوں سے تیار کردہ چائے پی رہے تھے۔ اتنے میں عقرب داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے بالوں والی ایک ٹوپی تھی۔

الاؤ کے قریب پہنچتے ہی اس نے کہا۔ "میں بہت دولت مند ہوتا جا رہا ہوں بھائیو۔ تم کیسے گدھے ہو کہ مجھے دیکھ کر احتراماً کھڑے بھی نہیں ہوتے۔"

"چل بے۔۔" ایرج نے جلتی ہوئی لکڑی اُٹھالی۔

"یہ ٹوپی تو دیکھنا پیارے۔" عقرب نے بالدار ٹوپی اُس کی طرف بڑھائی جس پر کئی جگہ دھات کے بنے ہوئے کچھ نشانات بھی نصب تھے۔

"ارے۔ یہ تو اُسی خیرہ سر کی معلوم ہوتی ہے۔"

"بالکل۔" عقرب نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ سر سے گرتی کس طرح ہے لیکن اس بار یہ میرے ہاتھ ہی میں رہ گئی۔"

"او کمبخت۔۔ کیوں خواہ مخواہ فساد برپا کر رکھا ہے، تو نے۔۔"

"سنتے جاؤ۔" عقرب نے قہقہہ لگایا۔ "اس وقت تو اس کے ڈیرے میں گھس کر ہاتھ کی صفائی دکھانی پڑی تھی۔ اس کے آدمی مجھ سے اس بُری طرح خائف ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ عذاب کا فرشتہ سمجھتے ہیں مجھے۔"

"اگر کسی وقت تیری نقلی داڑھی گر گئی تو سارا بہروپ دھرا رہ جائے گا۔" ایک ساتھی بولا۔

"لاؤ چائے۔" وہ بھی الاؤ کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔ چائے اسے دی گئی اور اس نے پہلے ہی گھونٹ پر بُرا سا منہ بنایا اور بولا "اوئے۔۔ یہ شاید کالی ٹکیوں سے بنائی ہے۔ کیسی بُری ہیک آرہی ہے۔ ربِ عظیم تم بے چاروں کی مفلسی دور کرے۔۔ خیر یہ لو۔" اس نے جھولے میں ہاتھ ڈال کر ایک پیکٹ نکالا اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "یہ آدھ سیر سبز چائے کی پتیاں ہیں۔ ربِ عظیم نے مجھے دولت مند بنایا ہے تو میں اپنے غریب بھائیوں کی مدد کیوں نہ کروں۔"

"سبز چائے۔" خوشی کا مشترکہ نعرہ غار میں بلند ہوا۔

"یہ کہاں سے ملی؟" ایرج بہت زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

"ضیغم کے ذخیرے سے۔۔"

"ادھر لاؤ۔۔" ایرج نے ہاتھ بڑھا کر پیکٹ لیا۔ اُسے کھولا اور ساری چائے الاؤ میں جھونک دی۔

"او پاگل۔۔ او گدھے۔۔ یہ کیا کیا؟" عقرب دونوں ہاتھوں سے رانیں پیٹتا ہوا چیخا۔

"کملاکیوں پر لوٹ کا مال حرام ہے۔ اسے مت بھولا کر۔۔" ایرج نے آنکھیں نکالیں۔

"او ایرج۔۔۔ او اکڑو۔۔ کیوں شامت آئی ہے۔" اس نے تھیلے سے چمڑے کا فلاخن (گوپھیا جس میں پتھر رکھ کر پھینکتے ہیں) نکالتے ہوئے کہا۔ "تیرے سر کے بھی ہزار ٹکڑے ہو جائیں گے، اگر مجھ سے اکڑا۔۔ ضیغم کے دو آدمیوں کو پانی مانگنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔"

ایرج نے اس طرح ہاتھ کو جنبش دی جیسے منہ کے قریب چکرانے والی کوئی مکھی اُڑائی ہو۔ دوسرے ہنسنے لگے اور عقرب سر جھکا کر چائے پینے لگا۔۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ "کل میں اُسے تیرے ہی ہاتھوں قتل کرا دوں گا۔"

اس پر کوئی کچھ نہ بولا۔ ایرج سر جھکائے الاؤ کے کنارے جمی ہوئی راکھ کو کرید رہا تھا۔

★★

دوسری شام ضیغم پھر شرجیل کے خیمے میں جا گھسا۔ پتہ نہیں کیوں اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

"او سرخسانی گدھے۔" اس نے خیمے کے در ہی پر رُک کر شرجیل کو مخاطب کیا۔ "میں تجھ سے جواب طلب کرنے آیا ہوں۔"

"آدمیوں کی طرح بات کرو ضیغم۔" شرجیل نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم اس طرح پیش آتے ہو۔۔ ڈرتا ہوں ربِ عظیم کے فرمان سے ورنہ۔۔"

"مجھے بتا کہ میرا دوست ضحاک کیسے مارا گیا تھا؟"

"ایک کملا کی چھوکرے کے ہاتھوں۔" شرجیل نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"لیکن تُو اس کا حمایتی تھا۔"

"آج بھی ہوں۔۔۔ تو پھر؟"

"اپنا خنجر نکال۔۔۔ میں تجھے للکارتا ہوں۔"

دفعتاً باہر سے آواز آئی۔ "جانے دو۔ مجھے اندر جانے دو، میں سردار ضیغم کی تلاش میں ہوں۔ وہ یہیں ہیں۔ ان کے ڈیرے پر معلوم کیا تھا میں نے۔"

"آنے دو۔۔۔ کون ہے؟" ضیغم جو آواز کی طرف متوجہ تھا غرایا۔ اس کے آدمی شاید باہر موجود تھے اور انہوں نے کسی آنے والے کو روکا تھا۔ در کا پردہ ہٹا اور آنے والے کو دیکھ کر شرجیل چونک پڑا لیکن خاموش ہی رہا تھا کیوں کہ اس نے بھی شرجیل کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ یہ عقرب تھا اور اس وقت بہروپ میں نہیں تھا۔

"تم کون ہو۔ کیا چاہتے ہو؟" ضیغم نے اسے گھور کر پوچھا۔

"میں فلک سیر ہوں سردار۔۔۔ اور آپ کے لیے ایک ایسی خبر لایا ہوں کہ آپ مجھے کم از کم ایک سیر چائے تو بخش ہی دیں گے۔"

"جلدی بکو۔"

"میں نے اس والد الحرام بوڑھے کا پتہ لگا لیا ہے۔"

شرجیل کے ہونٹ ہلے اور پھر سختی سے بند ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں اُلجھن کے آثار تھے۔

"کہاں ہے۔ کدھر ہے۔ میں تجھے پانچ سیر چاٹے دوں گا چھوکرے۔ میں اپنا مصاحب بناؤں گا، بہت بڑا آدمی ہو جائے گا تُو۔۔۔"

"سردار کی مہربانی۔۔۔" عقرب نے ہاتھ جوڑ کر دانت نکال دیے اور پھر بولا "لیکن سردار وہ ضرور کوئی بُری رُوح ہے۔ میں نے تھوڑی دیر ہُوئی اُسے ایک غار میں دیکھا تھا۔ اُف فوہ سردار۔۔۔" عقرب کانپ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے۔

"او۔۔۔ بول جلدی، ورنہ۔۔۔" ضیغم نے دانت پیسے۔

"ارے۔۔۔ وہ کچے خرگوش کھا رہا تھا۔ کھال سمیت" وہ پھر بُرا سا مُنہ بنا کر کانپ گیا۔

"وہ کوئی بھی ہو۔ میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا" ضیغم پیر پٹخ کر بولا۔

"اچھا تو پھر اپنے پانچ آدمی میرے ساتھ کر دیجئے۔ زیادہ بھیڑ ہُوئی تو وہ ہاتھ نہ آسکے گا"

"میں خود چلوں گا" ضیغم غرّایا۔

"ارے نہیں سردار۔۔۔ اگر اس نے پھر آپ کی توہین کی تو میں وہیں اپنی گردن ریت ڈالوں گا"

"بکواس مت کر۔ چل" ضیغم نے اسے دھکا دیا۔

پھر وہ باہر نکل کر بولا "پانچ آدمی۔۔۔ صرف پانچ آدمی آئیں میرے ساتھ" پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے پانچ آدمیوں کو بقیہ لوگوں سے الگ کیا اور عقرب کے ساتھ ایک جانب چل پڑا۔

ل

زیارت گاہ کے معبد میں بڑا عابد سربسجود تھا اور اس کے مرید۔۔۔ کچھ فاصلے پر نصف دائرے کی شکل میں ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ کچھ عجیب سا ماحول تھا۔ خوشبودار ہلکے دھوئیں کے لہریے جگہ جگہ فضا میں بل کھا رہے تھے۔ مشعلوں کی سُرخ روشنی میں ان کے چہرے ایسے لگ رہے تھے جیسے وہ کسی دوسری دُنیا کی مخلوق ہوں۔ یک بیک بڑے عابد نے سجدے سے سر اُٹھایا اور رحل پر رکھے ہُوئے بستے کو اُٹھا کر بوسہ دیا پھر اس کو بڑی احتیاط سے کھولا اور اس میں سے کچھ اوراق نکالے۔ چند لمحے ان پر جُھکا رہا پھر سر اُٹھا کر بولا "دیکھو۔۔۔ شام کا پہلا ستارہ مقبرے کے کلس کے اوپر پہنچا یا نہیں۔۔۔ کچے مقبرے کے پہلے زینے پر کھڑے ہو کر دیکھنا"

ایک مُرید حلقے سے نکل کر باہر چلا گیا۔ بڑے عابد نے ان اوراق کو دوبارہ جزدان میں تہ کر کے رحل پر رکھ دیا۔ اب اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

مرید جلد ہی واپس چلا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ ابھی شام کا پہلا ستارہ کلس کے اُوپر نہیں آیا"

"انتظار کرو" بڑے عابد نے پُرسکون لہجے میں کہا "بدنہاد شنگشت کا آخری وقت قریب ہے۔ پیر روشن ضمیر کی پیشگوئی یہی ہے مگر دیکھو۔ تم۔۔۔"

اُس نے ایک مرید کی طرف اُنگلی اُٹھا کر کہا "میرے قریب آؤ۔ میں تمھیں اُن دونوں کی نشانیاں بتاؤں گا"

مُرید اس کے قریب جاکر دوزانو ہو گیا اور اتنا جُھکا کہ اُس کی سرگوشیاں آسانی سے سُن سکے۔

★★

سورج غروب ہو رہا تھا۔ جب وہ ڈھلان سے اُتر کر عقرب کے بتائے ہُوئے غار تک پہنچے تھے۔

"اُف۔۔۔ فوہ۔۔۔ کھسک گیا شاید" عقرب چاروں طرف دیکھتا ہُوا بولا۔

"اے چھوکرے" دفعتاً ضیغم دھاڑا "اگر وہ نہ ملا تو میں تجھے اُسی طرح چبا جاؤں گا جیسے وہ کچے خرگوش کھا رہا تھا"

"رحم۔۔۔ رحم سردار" عقرب گڑگڑایا "میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ یہ دیکھو، خون کی بوندیں۔۔۔ خرگوشوں کا خون۔۔۔ اوہ۔۔۔ یہ دیکھو، یہ خرگوش کی دُم ہی تو ہے" اس نے سفید بالوں کا گُچھا سا زمین سے اُٹھایا۔

"میں تجھے جھوٹا نہیں سمجھتا" ضیغم بولا "لیکن آج خالی ہاتھ بھی نہیں جاؤں گا۔ اُس کا سر چاہیے مجھے۔۔۔ ہر حال میں"

"اوہو" عقرب ایک جانب دیکھتا ہُوا اُچھل پڑا "وہ دیکھو خون کی بوندیں اس طرف بڑھتی گئی ہیں۔ آؤ دیکھیں، شاید وہ اُدھر ہی گیا ہے"۔

وہ خون کی بوندیں تلاش کرتے ہُوئے آگے بڑھنے لگے اور اُس طرح وہ اُسی غار کے کسی دوسرے تنگ سے دہانے تک جا پہنچے۔ یہ اتنا تنگ تھا کہ ایک ساتھ دو آدمی کھڑے کھڑے نہیں گزر سکتے تھے۔ عقرب نے چاہا کہ خود پہلے نکل جائے۔

"نہیں۔۔۔" ضیغم اس کا شانہ دبوچتا ہُوا غرّایا "تم نہیں، پہلے میرے آدمی نکلیں گے"

"جیسی مرضی سردار کی" عقرب جہکا "میں تو خادم ہُوں" ضیغم کے اشارے پر اس کا ایک آدمی بیٹھ کر کھسکتا ہُوا دہانے سے گزر گیا اور باہر پہنچ کر آواز دی "سب ٹھیک ہے۔ آجاؤ۔۔۔"

پھر یکے بعد دیگرے پانچوں آدمی باہر نکل گئے۔ ضیغم عقرب کو روکے ہی رہا تھا۔ پانچویں آدمی کے بعد اس نے اُسے دہانے کی طرف دھکیلتے ہُوئے کہا "اب تم چلو"

۔۔۔ پھر عقرب کے پیچھے ہی پیچھے وہ بھی کھسکتا ہُوا، دوسری طرف نکل آیا۔ یہ ایک چھوٹی سی گہری وادی تھی۔ خون کی بوندیں سامنے والی ڈھلان تک پہنچ کر غائب ہو گئیں۔ یہاں ایک ایسا خرگوش بھی پڑا ملا جس کا سر غائب تھا۔ عقرب نے پہلی بار ضیغم کے چہرے پر کسی قدر سراسیمگی کے آثار دیکھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خرگوش کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پھر سورج پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گیا لیکن اُفق کے شوخ رنگوں والے چمکدار لہریے ابھی اتنے روشن تھے کہ فضا پر تاریکی نہیں مسلط ہُوئی تھی۔

ضیغم نے عقرب کی طرف مُڑ کر پلکیں جھپکائیں اور عقرب آسمان کی طرف ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا "ربّ عظیم مجھے معاف کر دے لیکن یہ سردار بھی تو شنگشت ہی ہیں۔ تیرے خاص الخاص بندے۔ اگر وہ عذاب کا کوئی فرشتہ ہی تھا تو ہم سب کو معاف کر دے۔ مجھے معلوم ہے۔۔۔ تُو اگر چاہے تو ہماری جیبوں میں پڑے ہُوئے کارتوس خود بخود چل جائیں اور ہمارے جسم چھلنی۔۔۔"

"کیا بک رہا ہے" ضیغم غرّایا لیکن اُس کی آواز میں خوف کی لرزش بھی شامل تھی۔

"بک نہیں رہا سردار۔ میرا باپ اسی طرح مرا تھا" عقرب نے رونی سی آواز بنائی "ایسے ہی ایک چھلاوے کی تلاش میں وہ بھی نکلا تھا۔ اس کی واسکٹ کی جیب میں دس کارتوس پڑے ہُوئے تھے۔ یقین کرو سردار وہ سارے کارتوس خود بخود چل گئے تھے اور اُس کا سینہ چھلنی ہو کر رہ گیا تھا"

"اچھا، اچھا۔ میں یہ جھگڑا ہی ختم کر دوں گا" ضیغم نے کہا اور اپنے آدمیوں سے بولا "سارے کارتوس ایک جگہ ڈھیر کر دو۔ ریوالور خالی کر دو، رائفلیں بھی۔۔۔ اور کلہاڑیاں سنبھال لو۔ میں شنگشت ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ فرشتوں پر میرا خون حرام نہ کیا گیا ہو"

اُس کے حکم کے مطابق ہر قسم کے کارتوس ایک تھیلے میں بھر کر غار کے دہانے میں چھپا دیے گئے۔ اَب اُن کے ہولسٹروں میں خالی ریوالور تھے۔

"اندھیرا پھیلنے سے پہلے" عقرب کچھ سوچتا ہُوا بولا "ہمیں اُسے تلاش کر لینا چاہیے"

"سردار۔۔۔" اُس کا ایک ساتھی بھرائی ہُوئی آواز میں بولا "اگر وہ فرشتہ ہی ہے تو ہم اُس پر کیسے ہاتھ اُٹھا سکیں گے"

"ضرور اُٹھا سکیں گے" ضیغم حلق پھاڑ کر دھاڑا "ربّ عظیم ایک شنگشت کی توہین کیوں کرا رہا ہے"

"ہم تو نہیں اُٹھائیں گے" پانچوں نے جھلّا کر بیک وقت کہا۔

"یہ بات ہے تو نکالو اپنی کلہاڑیاں۔۔۔ اور آجاؤ مقابلے پر۔۔۔ میرا حکم ماننے سے انکار کرنے کا مطلب یہی ہے کہ خون بہے"

"بھاگ چلو۔۔۔ بھاگو" ایک نے چیخ کر کہا اور بقیہ چاروں بھی اُسی کے پیچھے دوڑتے چلے گئے۔

"ٹھہرو، کمبختو ٹھہرو۔۔۔" ضیغم ہاتھ اُٹھا کر دہاڑا لیکن کون سُنتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک دراڑ میں گھُس کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"میرے خیال میں، سردار اَب واپس ہی چلو" عقرب نے کہا۔

"نہیں۔۔۔" وہ حلق پھاڑ کر بولا "کیا میں کسی سے ڈرتا ہوں۔ واپسی پر ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا"

"اے ربّ عظیم۔۔۔" عقرب نے پھر آسمان کی طرف ہاتھ جوڑ کر کہا "پتہ نہیں یہ کس خبط الحواس گدھے کی اولاد ہے میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا"

"کیا۔۔۔ ابے کیا کہا، تُو نے۔۔۔" ضیغم دھاڑتا ہُوا پیچھے

ہٹا اور پیٹی سے لٹکی ہُوئی کلہاڑی کا دستہ سنبھالنے لگا۔

عقرب نے ڈھلان میں چھلانگ لگا دی۔ ضیغم دھاڑتا ہُوا پیچھے ہٹا اور پیٹی سے لٹکی ہُوئی کلہاڑی کا دستہ سنبھالنے لگا۔

عقرب نے ڈھلان میں چھلانگ لگا دی۔ ضیغم لحیم شحیم آدمی تھا۔ اس لیے تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ اس کے برخلاف عقرب جو ہلکا پھلکا جسم رکھتا تھا چٹانوں پر بھی ہرنوں کی طرح چوکڑیاں بھرتا نظر آیا۔ ساتھ ہی وہ چیختا بھی جا رہا تھا "آ . . . اے عذاب کے فرشتے . . . اور اس خیرہ سر کو بھی اپنی خوراک بنا لے۔"

"ٹھہر تو جا . . . والدالحرام" ضیغم کلہاڑی تانے ہوئے بار بار کوشش کر رہا تھا کہ وہی اُس پر کھینچ مارے لیکن شاید اَب کلہاڑی بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے تاک میں تھا کہ نشانہ خطا نہ کرے لیکن عقرب نے ابھی تک تو اسے اس کا موقع نہیں دیا تھا۔

دفعتاً کسی نے ضیغم کو عقب سے للکارا۔ وہ نیچے وادی میں پہنچ چکا تھا۔

"ٹھہر . . . او خیرہ سر، تیری موت آ پہنچی۔"

ضیغم اُچھل کر آواز کی طرف مڑا۔ اس نئے آنے والے کو دیکھ کر تو وہ عقرب کو بھی بھُول گیا۔ یہ وہی جوان تھا جس نے شرجیل کے خیمے کے قریب اُس کے سینے پر گھونسہ مارا تھا اور بوڑھے چیت باز کی وجہ سے وہ اس سے انتقام بھی نہ لے سکا۔

"آجا . . . پہلے تو ہی آجا۔ مجھے تو تیری ہی تلاش تھی۔" ضیغم اکڑ کر بولا۔ "نکال کلہاڑی . . ."

ایرج قریب پہنچ گیا۔ دھند لکا پھیلنے لگا تھا لیکن اَب بھی اتنی روشنی تو تھی ہی کہ انہیں ایک دوسرے کی آنکھیں صاف نظر آ سکتیں۔

"نکال کلہاڑی۔" ضیغم نے پھر للکارا لیکن وہ خاموش کھڑا اُسے گھُورتا رہا۔

"تیسری بار کہوں گا۔ اُس کے بعد تُو کلہاڑی نکالے یا نہ . . . میں تجھ پر حملہ کر دوں گا۔" ضیغم نے کہا۔

"میری بھی ایک بات سُن لے۔" ایرج نے پُرسکون اور نرم لہجے میں کہا۔ "تو ایک شنگشت ہے۔ تجھے تو درویش ہونا چاہیے تھا۔ اب بھی آدمی بن جا۔ ربِّ عظیم تجھے معاف کر دے گا۔"

"او چھوکرے، کلہاڑی نکال نہیں تو سنبھل . . . یہ لے۔" اس نے اُچھل کر ایرج پر حملہ کر ہی دیا۔ اتنی قوت سے کلہاڑی چلائی گئی تھی کہ شاید پتھر میں بھی اُتر جاتی لیکن ضیغم اپنے ہی زور میں اُڑا دھڑام پیچھے چلا آیا۔ ایرج نے بڑی پھُرتی سے وار خالی کر دیا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی جو دُور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے، تالیاں بجانے لگے۔ ضیغم دھاڑتا اور گالیاں بکتا ہُوا پھر اُٹھا ہی تھا کہ عقرب نے گدھے کی طرح رینگنا شروع کر دیا۔ ضیغم جو مطمئن تھا کہ اُسے کوئی بھی جان سے نہیں مار سکے گا، اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سنکی تو تھا ہی . . . ویسے بھی اس کا ذہن اُلٹتا پلٹتا رہتا تھا۔

"چُپ رہ، چُپ رہ مسخرے . . . ورنہ سِسکا سِسکا کر ماروں گا۔" اُس نے عقرب کو للکارا۔

"مجھ پر خفا ہونے کی ضرورت نہیں سردار۔ اس وقت تمھارے باپ کی آوارہ رُوح میرے جسم میں حلول کر گئی ہے۔" عقرب نے کہا اور پھر گدھے کی طرح رینگنے لگا۔ ایرج ہنس پڑا۔

"تو ہنستا ہے، خنزیر . . . مجھ پر ہنستا ہے۔" اس نے دانت پیس کر پھر حملہ کیا لیکن اس بار شاید ایرج نے یہی تہیہ کر لیا تھا کہ وار خالی دے کر کلہاڑی چھین لے گا۔

کلہاڑی ہاتھ سے نکلتے ہی ضیغم ایرج سے لپٹ پڑا۔

"دیکھ، اَب بھی ہوش میں آجا۔" ایرج نے پھر اس سے کہا۔ "ورنہ . . ."

"ورنہ کیا ہو گا۔" ضیغم اُس سے گُتھا ہُوا بولا۔ "ابھی چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا۔"

"اپنی خیر منا . . . بھیک منگے۔ میں تجھے مار ڈالنے کے لیے بھڑا ہوں۔"

"میرا خون . . ." ضیغم نے وحشیانہ سا قہقہہ لگایا۔ "تُو میرا خون کرے گا . . . ہاہا . . . مجھ پر کون ہاتھ اُٹھا سکتا ہے۔ میں شنگشت ہُوں۔"

"ہرگز نہیں۔" عقرب نے ہانک لگائی۔ "خبردار اس پر ہاتھ نہ اُٹھانا۔ البتہ خود اِسے ہاتھوں پر اُٹھا سکتے ہو۔ جلدی کرو . . . شاباش . . . اسے زمین اور آسمان کے بیچ میں مرنا چاہیے۔ زمین پر نہیں . . . خیال رکھنا کہ ایک قطرہ خون بھی زمین پر گرنے نہ پائے۔ جلدی کرو۔"

ضیغم بھی خاصا طاقت وَر تھا۔ اتنا کہ طاقت کے زعم میں درویش کی بجائے "خیرہ سر" بن گیا تھا۔ اس وقت وہ کوشش کر رہا تھا کہ ایرج کو زمین سے اُکھاڑ کر دے پٹخے۔ اِدھر ایرج دراصل اس کا اندازہ لگانے کی فکر میں تھا کہ اُسے زمین سے اُکھاڑنے میں کتنا زور صرف کرنا پڑے گا۔ یک بیک اس نے اُس کی پیٹی پکڑ لی اور پھر ایسا جھٹکا مارا کہ ضیغم کے پیروں نے زمین چھوڑ دی۔

"ربّ السّمٰوات۔" ایرج کے نعرے سے پہاڑیاں بھی لرز گئیں۔

ضیغم اُس کے ہاتھوں پر بلند ہوتا جا رہا تھا۔ چیخ رہا تھا گالیاں بک رہا تھا۔

ایرج نے بائیں ہاتھ سے اس کی پیٹی پکڑ رکھی تھی اور داہنے سے گردن . . . داہنے ہاتھ کی گرفت آہستہ آہستہ تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

ضیغم نے اُسی عالم میں کمر سے خنجر کھینچنا چاہا لیکن عقرب نے، جو قریب آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر چابک مارنا شروع کر دیا۔

ہاتھ تو آزاد تھے ہی، لمبا تڑنگا بھی تھا۔ بہ آسانی ایرج کی گردن خود بھی پکڑ لیتا لیکن عقرب نے کسی مشاق چابک باز کی طرح اُسے بے بس ہی رکھا۔ ضیغم پاگل ہُوا جا رہا تھا۔ اب اس کی زبان سے الفاظ نہیں ادا ہو رہے تھے۔ صرف غضب ناک قسم کی کریہہ الصوت چیخیں نکل رہی تھیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی زخمی شیر بے بس ہو جانے کے بعد غصّے میں ہاتھ چبا رہا ہو۔

. . . پھر یہ آوازیں آہستہ آہستہ گھُٹتی گئیں۔ ایرج اُسے اُوپر ہی اُٹھائے رکھنے کے لیے جدّوجُہد کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھِنچے ہُوئے تھے۔

"خرّر . . . خرّر . . . خرّر . . . خیں . . ." یہ ضیغم کے حلق سے نکلنے والی آخری آوازیں تھیں۔

شرجیل خوشی تو ظاہر کر رہا تھا لیکن حقیقتاً دِلگرفتہ تھا۔ کیوں کہ ایک شنگشت مارا گیا تھا۔ پتہ نہیں اب کیا ہو۔ کتنی وبائیں پھُوٹیں، کتنے طوفان آئیں، کتنی ژالہ باری ہو۔ ایرج اُسے ختم کر کے سیدھا شرجیل ہی کے خیمے میں آیا تھا۔ یہاں ضیغم کا ڈیرہ پہلے ہی سے سُنسان پڑا تھا۔ اس کے وہ پانچوں ساتھی یہاں واپس پہنچے تھے اور پھر انہوں نے دوسرے مصاحبوں سے نہ جانے کیا کہا تھا کہ وہ بدحواسی کے عالم میں فرار ہوتے وقت اپنا بہتیرا سامان بھی چھوڑ گئے تھے پھر ایرج اور اس کے ساتھی آئے اور اُنہوں نے شرجیل کو بتایا کہ بڑے عابد کی پیشگوئی سچ ثابت ہُوئی . . . ضیغم کی لاش ایک درخت کی شاخ سے جھُول رہی ہے۔ مَرنے کے بعد بھی اُسے زمین نہ مل سکی۔

پھر انھوں نے زیارت گاہ کے نقیبوں کی آوازیں سُنی تھیں جو سارے میلے میں چیختے پھر رہے تھے۔ "خیرہ سر شنگشت کے قاتل کو بڑے عابد نے طلب کیا ہے۔ دو الگ جسم رکھنے والا ایک آدمی . . . جہاں کہیں بھی ہو، فوراً زیارت گاہ میں پہنچے۔ اس کا ایک جسم دُبلا پتلا ہے اور دوسرا تنومند۔"

ایرج نے حیرت سے عقرب کی طرف دیکھا اور عقرب نے ہنس کر کہا۔ "چلو۔"

شرجیل زیارت گاہ کی طرف جانے کی ہمّت نہیں رکھتا تھا۔ وہی دونوں گئے لیکن پھر جب اس نے کچھ دیر بعد شادیانے کی آواز سُنی تو اُٹھ کر بے تحاشا زیارت گاہ کی طرف دوڑا گیا۔

یہاں ایرج اور عقرب بڑے عابد کے سامنے دم بخود کھڑے تھے۔ وہ اپنا داہنا ہاتھ اُٹھائے کہہ رہا تھا۔ "ایرج اور عقرب ایک ہی شخصیت ہے۔ ایرج قوّت ہے اور عقرب عقل . . . اب شنکرال کے دِن پھرنے والے ہیں۔ تین سو سال ہُوئے جب شمال کے ناپاکوں نے سر اُٹھایا تھا۔ شنکرال میں تباہیاں پھیلا دی تھیں۔ اسی وقت سے ربّ عظیم کے عابد تمھاری آمد کی خبر دیتے رہے ہیں۔ مقدس اَوراق میں اُن کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔ اُنھی میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تمھارے ہاتھوں ایک ناپاک شنگشت گلترنگ کی زیارت گاہ کے قریب اُس وقت مارا جائے گا جب شام کا پہلا ستارہ مقبرے کے کلس کے اوپر ہو گا۔ پیش گوئی پوری ہُوئی۔ خوش آمدید . . . اَب میں تمھیں اس مقدّس مہم کی اجازت دیتا ہوں جس کے لیے تم خلق کیے گئے ہو۔ تم شمال میں جاؤ گے اور ربِّ عظیم کا نام اونچا کرو گے لیکن یاد رکھنا جس دِن تم دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہُوئے، وہ بڑا منحوس دن ہو گا۔ اس سے بچتے رہنا۔"

اُس کے خاموش ہوتے ہی حلقہ بگوش ربّ السّمٰوات کی حمد گانے لگے . . . بخوردانوں سے خوشبودار دھُوئیں کی لکیریں اُٹھ اُٹھ کر فضا میں قوسیں اور دائرے بناتی رہیں۔

پردیسی لنترانی
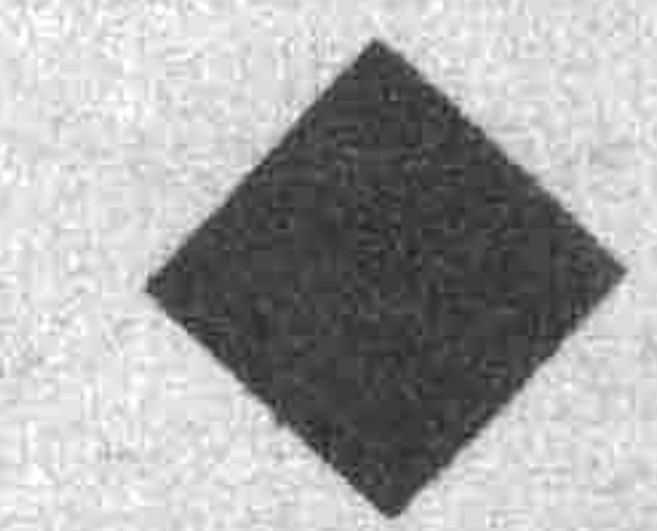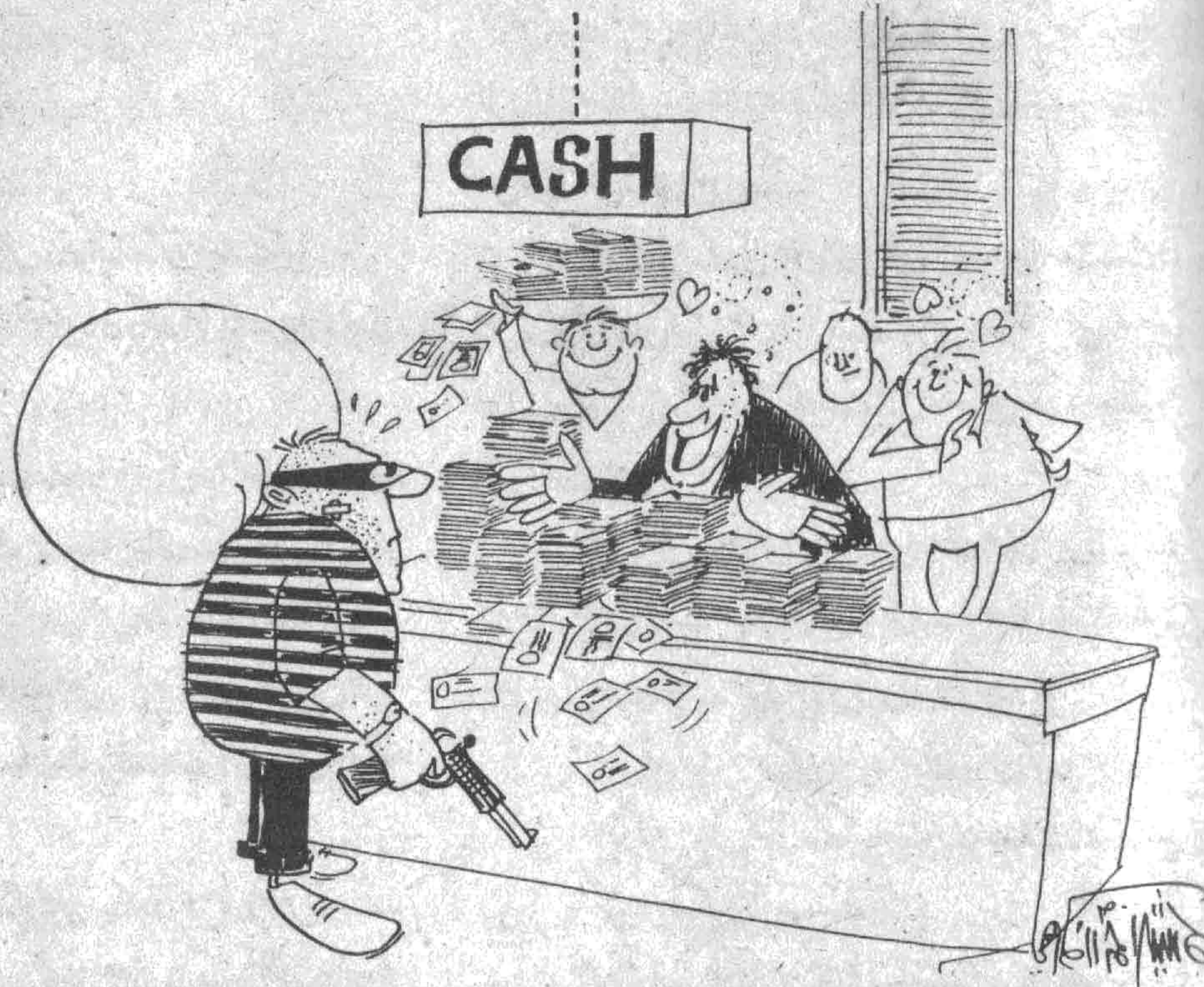
ابنِ صفی

اس شخص کی کہانی جو سات سمندر پار نہ جانے کیا کیا ارادے کر گیا تھا۔
اگر یہ کہا جائے کہ ابنِ صفی ہی یہ کہانی لکھ سکتے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔

شکاگو کے بارے میں بہت کچھ سُن اور پڑھ رکھا تھا لیکن یہاں پہنچ کر محسوس ہُوا جیسے وہ کسی دوسری دُنیا کی باتیں رہی ہوں، نہ کہیں کوئی بینک لُٹتا نظر آیا اور نہ فائروں کی آوازیں ہی سُنائی دیں۔ کئی راہ گیروں کو گھور کر دیکھا اور انتظار کرتا رہا کہ پڑا چہرے پر مکّا لیکن وہ مجھے اس طرح نظر انداز کر کے گزر گئے کہ سخت مایوسی ہُوئی۔ ایک خوفناک چہرے والے سے دیدہ دانستہ ٹکرایا بھی تھا لیکن وہ "دیٹس آل رائٹ" کہتا ہُوا برابر والی گلی میں مُڑ گیا۔

یہ شکاگو ہے یا لکھنو۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں نے سوچا اور اچھی سی ملازمت کی تلاش جاری رکھی۔ میرے پاس انجینیئرنگ کی ڈگری تھی لیکن شکاگو والوں کا کہنا تھا کہ ڈگری امریکہ ہی کی کسی یونیورسٹی کی ہونی چاہیے۔ معمولی مزدور کی حیثیت سے کام کرنا چاہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اپنے دیس میں اتنی ناقدری تو نہ ہوتی۔ سوچ سوچ کر خود پر غصہ آنے لگتا۔ ایک آدھ سال انتظار ہی کر لیا ہوتا۔ امریکہ کی طرف بھاگ کھڑے ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

بہرحال جب مالی حالت بہت غیر ہوگئی تو مجبوراً مزدوری ہی پر قناعت کرنی پڑی۔ ایک کارخانے میں سوڈالر فی ہفتہ پر ملازمت اختیار کر لی۔

اب اسے میری بدقسمتی ہی کہنا چاہیے کہ اپنے انچارج کو ایک دن کسی ٹیکنیکل معاملے پر ٹوک دیا۔ وہ غلطی کر رہا تھا جس کے نتائج اچھے نہ ہوتے۔ اس نے اپنی غلطی کی اصلاح تو کر لی اور میرا شکریہ بھی ادا کیا لیکن دوسرے ہی دن مجھے غیر تشفی بخش کارکردگی کا نوٹس مل گیا اور مجھے ایک ہفتے بعد ڈس مس بھی کر دیا گیا۔

دوسرے کارخانے میں بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ میں نے سوچا اپنی زبان بند نہ رکھ سکوں گا۔ لہٰذا کارخانوں کی ملازمت کا خیال ہی دل سے نکال دینا چاہیے۔

گوشت خور ہوں لیکن ذبیحہ کھاتا ہوں اس لیے ایک یہودی کے پب میں کھانا کھاتا تھا۔ میں جب بھی وہاں جاتا پب کا مالک بہت غور سے دیکھتا رہتا۔ اس لیے میں بھی کبھی کبھی محض شناسائی کے اظہار کے طور پر سر ہلا دیتا۔

ایک دن جب میں واقعی بہت پریشان تھا وہ میری

میز کے قریب آکر بولا۔ "اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ کچھ پریشان سے نظر آرہے ہیں۔"

"جی ہاں! اور پریشانی کی یہ وجہ ہے کہ میری ملازمت چھوٹ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ پھر اُس کے استفسار پر اپنے احوال سے مفصل طور پر آگاہ کیا۔

"آپ کہاں کے باشندے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"پاکستان کا۔"

"یقیناً مسلمان ہوں گے!"

"جی ہاں۔ خوش قسمتی سے!"

"جانور ذبح کرنا آتا ہے؟"

"کیوں نہیں!" میں نے چہک کر کہا۔ "ہر سال عیدالاضحیٰ کے موقع پر خود ہی ذبح کرتا ہوں۔"

"تو پھر اپنی نوکری پکّی سمجھیے۔"

"میں نہیں سمجھا جناب۔"

"روزانہ صرف دو گھنٹے کام کے ہوں گے اور پھر عیش! تنخواہ سوڈالر فی ہفتہ بقیہ وقت آپ اپنی تعلیم پر صرف کر سکیں گے۔"

"اوہو! کام بھی تو بتایے!" میں نے مضطربانہ پوچھا۔

"ہمارے مذبح میں گائے اور بکرے ذبح کرنا۔ اور ہاں تنخواہ کے علاوہ ڈھائی پونڈ گوشت بھی روزانہ ملے گا۔"

کبھی ایسا دل نہ دُکھا ہوگا۔ بس کراہ کر رہ گیا تھا۔ ایک کوالیفائڈ انجینیئر جانور ذبح کرتا پھرے۔ اے خدا یہ کس گناہ کی سزا ہے؟

بہرحال، پیٹ بھرنے کے لیے جانوروں پر چُھری پھیرنے کی ٹھہری لیکن ذہن میں باغیانہ خیالات پرورش پاتے رہے۔

ایک دن میں نے پب کے یہودی مالک مسٹر چارلس بارٹلٹ سے شکاگو میں ڈکیتیوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر مغموم لہجے میں کہا۔ "پچھلے ایک سال سے یہاں کسی بھی بینک میں ڈاکہ نہیں پڑا۔ لہٰذا میں نے تو اخبار ہی دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔"

"پولیس سخت ہوگئی ہوگی۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہونہہ پولیس!" اس نے حقارت سے کہا۔ "پولیس ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔"

"تو پھر لٹیرے شریف ہوگئے ہوں گے۔"

"ایسا بھی نہیں ہے!"

"پھر کیا بات ہے؟"

"خدا ہی جانے!" اُس نے مایوسی سے کہا۔ "اب تو شکاگو میں رہنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ ہفتوں گزر جاتے ہیں اور کوئی سنسنی خیز خبر بھی سُنائی نہیں دیتی۔ تم یہ تو جانتے ہی ہو گے کہ ہم امریکی ٹھائیں ٹھوئیں اور چھین جھپٹ کے کتنے رسیا ہیں۔"

"تب تو یقیناً آپ کا دم گھُٹ رہا ہو گا۔"

"صد فیصد یہی بات ہے۔"

"میں کوشش کروں؟" میں نے جھک کر آہستہ سے کہا۔

"تم۔!" وہ مجھے کچھ دیر بے یقینی سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "بھلا تم کیا کر سکو گے! پردیسی ہو!"

"اس کے باوجود بھی تمہارے ادیبوں کی بدولت بہت کچھ کر سکوں گا۔ اُن کی کہانیوں کے ترجمے ہمارے یہاں کے رسائل میں بے تحاشا شائع ہوتے ہیں۔ اور ان کہانیوں میں وہ ڈاکہ ڈالنے کی جو تدبیر بتاتے ہیں، اتنی آسان ہوتی ہیں کہ بچے بھی اُن پر عمل کر سکتے ہیں۔"

"تو تم یہاں کیوں جھک مارنے چلے آئے ہو! وہیں لُوٹ مار مچائی ہوتی۔"

"دراصل یہاں لُٹیرے پولیس کے قابو میں نہیں آتے۔ یا تو صاف نکل جاتے ہیں یا اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ ہماری طرف دوسرا معاملہ ہے۔"

"کیا معاملہ ہے۔"

پولیس فوراً دھر لیتی ہے۔"

"ناممکن...."

"یقین کیجیے جناب، میرے علم میں ایسی کوئی ڈکیتی نہیں ہے کہ جس کے مجرم بالآخر پکڑے نہ گئے ہوں....!"

"بڑی عجیب بات ہے! ہماری پولیس دُنیا کی ترقی یافتہ ترین پولیس ہے، وہ بھی صد فیصد کامیاب نہیں ہوئی۔"

"ہماری طرف رُوحانی معاملات ہیں!" میں نے بڑے فخر سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"پولیس والے دُعا تعویذ کراتے ہیں۔ جہاں کسی عامل سے تعویذ لے کر پتھر کے نیچے دبا دیا۔ ڈاکو ہاتھ باندھے ہوئے خود ہی تھانے میں حاضر ہو گئے۔"

"تمہاری بکواس میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"نہیں آئے گی.... رُوحانی معاملات ہیں، آپ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ آپ چاند پر راکٹ تو بھیج سکتے ہیں لیکن زمین کے چور پکڑنا آپ کے بس کی بات نہیں۔"

"بس اُتر آئے مشرقی کمینگی پر۔" وہ بُرا سا مُنہ بنا کر بولا۔

"میں نہیں سمجھا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں!"

"تم لوگ ہم پر یہی اعتراض کرتے ہو.... کہ ہم زمین کے مسائل تو حل کرتے نہیں، چاند پر دوڑے جاتے ہیں۔ تو سُنو میرے دوست! زمین پر اسرائیل کے علاوہ اور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اُسے ہم کسی نہ کسی طرح حل کر ہی لیں گے۔"

"بات ڈاکے کی ہو رہی تھی۔ آپ سیاست لے دوڑے۔"

میں نے بُرا مان کر کہا۔ "کیا فرق ہے ہم میں اور تم میں۔ تم بھی ذبیحہ کھاتے ہو اور ہم بھی ذبیحہ کھاتے ہیں۔ تم بھی ختنہ کراتے ہو، ہم بھی ختنہ کراتے ہیں۔"

"بس بس چاپلوسی نہیں۔" وہ ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "یہاں ہمارے مُنہ پر تعریفیں کر کے ہم سے فائدہ اُٹھاتے ہو اور اپنے ملک میں واپس جا کر نعرہ لگاتے ہو کہ یہودیوں کو فنا کر دو۔"

"میں تعریف نہیں کر رہا۔ مماثلت بیان کر رہا ہوں۔"

"ختم کرو! ہاں تم ڈاکے کی بات کر رہے تھے۔"

"مُوڈ خراب کر دیا آپ نے!"

"کوئی بات نہیں، میری طرف سے بیئر کا ایک جگ پیو۔ مُوڈ ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن مُوڈ ٹھیک ہونے پر دو جگ صرف ہوئے۔

پھر قبل اس کے کہ ہم معاملے کی گفتگو دوبارہ شروع کرتے، جے سیکا آگئی۔ یہ ایک یہودی سہ شیزہ تھی۔ دوشیزہ اس لیے نہیں کہتا کہ اُس کی عمر تیس سال سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ پتہ نہیں کیوں بیس سال سے زیادہ عمر والی کو دوشیزہ کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے لہٰذا بیس سال سے زیادہ عمر والی کو سہ شیزہ ہی کہتا ہوں اور تیس سال سے اوپر والی تو آفاقی پیمانے پر مشکیزہ ہوتی ہے۔

بہرحال، اُس سہ شیزہ کو کسی نہ کسی طرح میری "گرل فرینڈ" ہونے کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔ اتنی اسمارٹ تھی کہ مجھے اُلّو کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ اب اُس کے حُسن کی کیا تعریف کروں۔ شریف آدمی ہوں۔ شرم آتی ہے۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اُس نے آتے ہی سوال کیا۔

"فروٹ چاٹ۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ کیا چیز ہے۔"

"اگر مرچیں زیادہ ہوں تو دوسری صبح معلوم ہوتا ہے کہ کیا چیز ہے!"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں اس لیے میں تم کو اُلّو کہتی ہوں!"

"جو دل چاہے کہہ لو۔ میں یہاں ڈالر کمانے آیا ہوں۔"

"چلو اُٹھو.... آج تم نے پکچر دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔"

میں نے بے بسی سے بارٹلٹ کی طرف دیکھا اور اس نے ہاتھ ہلا کر بیزاری سے کہا۔ "جاؤ۔ جاؤ۔ اس مسئلے پر پھر بات کریں گے۔"

شام اچھی گزری ماسوا اس کے جے سیکا نے مجھے تین سو تریسٹھ بار اُلّو کہا تھا۔ پتہ نہیں سمجھتی بھی تھی یا صرف اوپری دل سے کہتی تھی۔

کچھ بھی ہو، میرے ذہن میں تو صرف ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح شکاگو کے بینکوں کو لُوٹا جائے۔ وہ شاید میری ذہنی کیفیت کو تاڑ گئی تھی اس لیے سر ہو گئی۔

"بُوڑھے بارٹلٹ سے کس مسئلے پر گفتگو ہو رہی تھی؟"

"بہت ہی مردانہ مسئلہ تھا، تم سُن کر کیا کرو گی۔"

"پھر وہی اُلّو پن کی باتیں.... ہمارے یہاں مردانہ اور زنانہ مسائل الگ الگ نہیں ہوتے۔"

"وہ دراصل.... ہم سوچ رہے تھے کہ تازہ گوشت کے لیے آئندہ پب کے تہ خانے ہی میں کیوں نہ جانور ذبح کیے جائیں۔"

"تم لوگوں نے کوئی ایسی حرکت کی تو میں پولیس کو مطلع کر دوں گی۔"

"مجھے تم سے ایسی اُمید نہیں تھی۔ کیا اسی کا نام محبت ہے۔" میں نے دردناک لہجہ اختیار کر کے کہا۔

"محبت!" وہ ہنس پڑی۔ "واقعی اُلّو ہو۔"

"بس بس۔" میں نے بگڑ کر کہا۔ "مجھے جو چاہو کہہ لو لیکن محبت کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی نہ سُن سکوں گا۔"

وہ اور زور سے ہنس کر بولی۔ "اب تو گدھے بھی ہو!"

غصہ آیا تھا لیکن میں نے اُس پر ظاہر نہیں ہونے دیا.... محبوبہ تھی نا.... بیوی ہوتی تو کھال کھینچ کر بھُس بھر دیتا۔

بہرحال، وہ مجھے کسی طرح بھی اصل بات کہہ دینے پر مجبور نہیں کر سکی تھی۔

دوسرے دن پھر پب کے مالک سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس معاملے میں بے حد سنجیدہ ہو رہا تھا۔ خود ہی بات چھیڑی۔

"اگر تم شکاگو کی زندگی میں ہلچل پیدا کر سکے تو ہیرو کہلاؤ گے۔" پُر تفکر لہجے میں بولا۔ "سب سے پہلے تمہیں فیلکن بینک لُوٹنے کا مشورہ دُوں گا۔"

"لیکن کس طرح؟" میں نے کہا۔ "کم از کم دو ساتھی اور بھی تو ہوں۔ ایک باہر گاڑی میں بیٹھا رہے، دوسرا صدر دروازے پر رُک کر حاضرین و ملازمین کو روکے رکھے اور میں تجوریاں صاف کر دُوں۔"

"ساتھی نہیں ملیں گے۔ یہاں کے لوگ بُزدل اور نکمے ہو گئے ہیں۔"

"تنہا تو ناممکن ہے۔ ایسا کوئی طریقہ تمہارے ادیبوں نے نہیں لکھا۔"

"ادیبوں کو جہنم میں جھونکو!" وہ جھنجلا کر بولا۔ "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، غور سے سنو! حالات ایسے ہیں کہ تم تنہا ہی شکاگو میں سنسنی پھیلا سکتے ہو اور اسے یاد رکھو کہ یہاں سنسنی پھیلانے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کوئی بھی تمہاری راہ روکنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ بس جسے بھی دیکھنا ذرا کڑے تیوروں سے دیکھنا۔"

میں بھلا اُس کی باتوں میں آنے والا تھا اُس کی ہاں میں ہاں ملا کر وہاں سے رُخصت ہو گیا۔ کم بخت نے گردن کٹوانے کی ترکیب بتائی تھی۔

میں نے سوچا کیوں نہ یہاں کے مشہور ڈاکوؤں سے اس مسئلے پر گفتگو کی جائے۔ لہٰذا اُسی شام کو میں گریٹی سے ملا۔ یہ شکاگو کا سب سے زیادہ تجربہ کار اور کئی بار کا سزایاب ڈاکو تھا۔

جریز کارنر کی ایک میز کے قریب بیئر کا بڑا سا جگ لیے بیٹھا تھا۔ "کیا میں یہاں بیٹھ جاؤں، جناب!" میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"کیوں؟" وہ غرّایا۔

"آپ کا آٹوگراف لینا چاہتا ہوں۔"

"میرا آٹوگراف!" اُس نے حیرت کے لہجے میں کہا اور پھر سر کی جنبش سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"شکریہ جناب!" میں نے کُرسی کھینچ کر اُس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دراصل یہاں کے ایک مصنف نے آپ سے متعلق بڑی محیر العقول کہانیاں لکھی ہیں.... میں آپ سے بے حد متاثر ہوں جناب!"

"اوہ! پُرانی باتیں!" وہ بے پروائی سے ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "جہنم میں جھونکو۔"

"لیکن مجھے حیرت ہے کہ آج کل شکاگو میں سنّاٹا کیوں ہے؟"

"کوئی اور بات کرو۔!"

"یہاں لوگ زندگی سے بیزار نظر آ رہے ہیں.... سنسنی

رہا جننے اب!"

"تو پھر میں کیا کروں...؟"

"تو پھر ڈاکے ڈالیے۔"

"بکواس! آؤٹ آف ڈیٹ ہو گیئں یہ باتیں۔ زندگی کو ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر نہیں چلتے رہنا چاہیے۔"

"تو پھر میں مایوس ہو جاؤں!" میں نے مُردہ سی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب!"

"میں نے تو سوچا تھا کہ آپ کی مدد سے شکاگو کے بینک لُوٹوں گا۔"

"میری مدد کی کیا ضرورت ہے! آج کل تو چڑیا کا بچہ بھی بینک میں ڈاکے ڈال سکتا ہے۔"

میں نے اس کی وضاحت چاہی تو اس نے بھی قریب قریب وہی دلائل پیش کیے جو پب کے مالک کی زبانی سُن چکا تھا لہٰذا کاندھے لٹکائے ہُوئے وہاں سے چلا آیا۔

وہ رات بھی بے چینی سے بسر ہوئی تھی۔ بہر حال تین دن تک شکاگو کے نامی گرامی ڈاکوؤں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن سب کے سب گریٹی ہی کی طرح "نروان" حاصل کرنے کے چکّر میں پڑے ہُوئے تھے کسی نے میرا ساتھ دینے کی حامی نہ بھری۔

تھک ہار کر پھر بُوڑھے ہاٹرلٹ کے پاس آ بیٹھا۔

"کہو جیالے۔ کیا رہی؟" اس نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

"پتا نہیں۔ انہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کن کی بات کر رہے ہو؟"

"گریٹی۔ گیسپر۔ اسپینس بُل... میک اُو ہارا... ٹراوٹ سب کے سب افیونی ہو کر رہ گئے ہیں!"

"تم آخر میرے مشورے پر عمل کیوں نہیں کرتے، تمہارا بال بھی بیکا ہو جائے تو خودکشی کر لُوں گا۔"

"اب یہی ہو گا!" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"شاباش۔ تو میرا نکتہ نظر تمہارے ذہن نشین ہو گیا ہے؟"

"بالکل۔"

"فیلکن بینک سے ابتدا کرو۔ میں اُس کا نقشہ بنا کر تمہیں دُوں گا۔"

"دیر نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

وہ رات اسی شش و پنج میں گزری کہ بُوڑھے کے مشورے پر عمل کیا جائے یا نہیں؟ یہ امریکن بڑے بھولے ہیں۔ ایسی معصومیت سے غلطی کرتے ہیں کہ ان کی "سادگی" پر ہی مر جانے کو جی چاہتا ہے۔

یہی دیکھ لیجیے کہ کمبوڈیا میں پرنس سہانوک کی فوج کے دھوکے میں بار بار لون نول کے مورچوں پر بمباری کیے جا رہے ہیں۔ اگر کوئی پوچھ بیٹھے "بھائی! بار بار غلط فہمی کیسی؟" تو متحیر ہو کر خود سوال جڑ دیں گے، "کیا مطلب؟ کیسی غلط فہمی؟"

وضاحت کیجیے تو مُنہ بسُکا کر کہہ دیں گے۔ "مرنا تو بہر حال کمبوڈینوں ہی کو ہے خواہ وہ لون نول کے حامی ہوں، خواہ سہانوک کے لہٰذا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"جہنم میں جائیں۔ آخر اس ادھیڑ بُن سے تنگ آ کر میں نے سوچا۔ جو کچھ بھی کرنا ہے کر گزرنا چاہیے۔ ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔

دوسرے دن بوڑھے نے بینک کا نقشہ میرے حوالے کرتے ہوئے پوچھا "پستول ہے؟"

"پپ پستول... ہاں ہاں ہے... تم فکر نہ کرو۔" میں جلدی سے بولا۔ خدشہ تھا کہ کہیں اصلی والا پستول بھی نہ تھما دے۔

میری اسکیم میں نقلی پستول شامل تھا۔ اس لیے پکڑے جانے کی صورت میں اپنے بچاؤ کی تدبیر بھی تو پہلے ہی سے کر رکھی تھی۔

بہر حال، وہ وقت بھی آ ہی گیا جب میں نے فیلکن بینک میں قدم رکھا۔ پہرے دار نے اپنی بندوق فرش پر ڈال دی اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر بُت بن گیا! اب نقلی پستول کا رُخ کاؤنٹر کی طرف تھا۔

"خبردار کوئی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے۔" میں نے کڑک کر کہا۔ خوفناک صورت والا نقلی پستول مجھے اس وقت اپنے ہاتھ میں توپ لگ رہا تھا۔

گاہکوں اور ملازموں نے اپنے ہاتھ اُٹھا دیے تھے لیکن اُن کے چہرے کھلے پڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بچّوں نے کوئی انوکھا کھلونا دیکھ لیا ہو۔

"کیشیئر!" میں نے دھاڑنے کی کوشش کی اور ایک آدمی ہاتھ اُٹھائے ہُوئے کاؤنٹر سے باہر آیا۔

"صبح بخیر جناب!" میرے قریب پہنچ کر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے سلام عرض کیا ہے جناب اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اندازاً کتنے کا ٹارگٹ ہو گا؟"

"ایک ملین ڈالر۔ بڑے نوٹوں کی شکل میں!"

"تھیلا لائے ہیں؟" اس نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"وہ بھی تم ہی مہیا کرو گے۔"

"بہت بہتر آیئے میرے ساتھ۔" وہ ہاتھ اُٹھائے ہُوئے ایک طرف مُڑ گیا۔ میں نے پستول کی نال اُس کی کمر سے لگا دی اور کڑک کر پوچھا "اگر کسی نے بھی کوئی غلط حرکت کی تو میں کیشیئر کو مار ڈالوں گا۔"

کیشیئر اسٹرنگ رُوم میں آیا اور میری طرف مُڑ کر بولا "اگر اجازت ہو تو اب میں اپنے ہاتھ نیچے کر لوں۔ تھیلا بھی فراہم کرنا ہے اور تجوری بھی آپ سے نہیں کُھلے گی۔"

"اجازت ہے!" میں نے سانپ کی طرح پھنکارنے کی کوشش کی۔

اس نے تجوری کھولی اور تھیلے میں نوٹوں کے بنڈل بھرنے لگا۔

دس لاکھ ڈالر... خدا کی پناہ... میرا ذہن گویا ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دے گئی تھی۔

تھیلا بھر لینے کے بعد اُس نے کہا "چلیے آپ کو گاڑی تک چھوڑ آؤں۔"

"نہیں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"دھر لیے جائیں گے۔ میں خود تھیلا گاڑی تک پہنچاؤں گا۔ تو کوئی آپ کی طرف توجّہ نہ دے گا۔"

"اوہو! اس مہربانی کی وجہ؟"

"آپ اہلِ شکاگو کے محسن ہیں۔ کل کے اخبارات میں پڑھ لیجیے گا۔"

"تم عجیب باتیں کر رہے ہو لیکن یاد رکھو میں تمہاری کوئی چال کامیاب نہ ہونے دُوں گا۔"

"آپ پردیسی معلوم ہوتے ہیں، جناب۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ آپ کو مفید مشورے دُوں... یہ رہا میرا کارڈ۔ شام کی چائے میرے ساتھ ہی پیجیے گا۔"

میں نے بائیں ہاتھ سے اُس کا وزٹنگ کارڈ لے کر جیب میں ڈال لیا اور آہستہ سے بولا "اچھی بات ہے اگر اہلِ شکاگو اسی میں خوش ہیں تو یہی سہی... چلو تھیلا میری گاڑی تک پہنچا دو۔"

"بس آپ پستول کی نال میری کنپٹی سے لگائے ہوئے صدر دروازے تک چلیے... باہر نکل کر پستول جیب میں ڈال لیجیے گا۔"

مشورہ معقول تھا لیکن... عقل بُری طرح چکرائی ہُوئی تھی۔ اب ایسا بھی کیا ہیجان کہ خود لُٹنے والا لُٹیرے کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ بہر حال، اس صادق القول کیشیئر نے تھیلا میری گاڑی کی اگلی سیٹ پر رکھ دیا اور گرم جوشی سے مصافحہ کرتا ہُوا بولا "شام کو میرے گھر ضرور آیئے گا۔ میں منتظر رہوں گا۔"

جواب میں کچھ کہے بغیر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہُوا اتنا نروس ہو گیا تھا کہ گاڑی کے اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس سڑک کو چھوڑ دینے کے بعد مُڑ کر دیکھا کہ کہیں تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ ہو سکتا ہے کہ کیشیئر نے میرے لیے کسی قسم کا جال بچھایا ہو لیکن کچھ دیر بعد یہ محض واہمہ ثابت ہُوا۔ بخیریت و عافیت گھر پہنچ جانے کے بعد میں نے تھیلے کو کھول کر دیکھا اور ایک بار پھر پورے جسم میں سنسنی پھیل گئی... دس لاکھ ڈالر... سنسنی بڑھتی گئی اور میں بالآخر بے ہوش ہو گیا۔

شام کو کیشیئر کی دعوت یاد آئی جیب سے کارڈ نکال کر دیکھا اس پر فون نمبر بھی درج تھے۔ میں نے سوچا پہلے فون ہی کیوں نہ کر لیا جائے۔ نمبر ڈائل کیے اور دوسری طرف سے کسی کی آواز سُنائی دی۔

"میں فیلکن بینک کے کیشیئر سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں ہی بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"کون ہے؟"

"پردیسی لُٹیرا۔"

"اوہ۔ تو تو... مائی ڈیئر... پردیسی ہیرو کہو... کیا تم نے شام کا اخبار نہیں دیکھا!"

"نہیں... میں تو قیلولہ کر رہا تھا..."

"قیلولہ کیا ہوتا ہے؟"

"ہوتا ہے۔ مجھے اس کی انگریزی معلوم نہیں!"

"خیر... خیر کتنی دیر میں پہنچ رہے ہو... میرے متعلقین

تمہارا آٹو گراف لینا چاہتے ہیں!"

"اچھا... اچھا... میں آرہا ہوں" غیر ارادی طور پر میری زبان سے نکلا... میں پھر نروس ہونے لگا تھا۔

کیا وہ اپنا حصہ چاہتا ہے؟ میں نے سوچا ضرور یہی بات ہے۔ چلو کیا قباحت ہے۔ اگر آدھے کا مطالبہ کیا تب بھی پانچ لاکھ ڈالر میرے لیے بہت ہیں۔ اس طرح ایک عینی شاہد بھی قابو میں آجائے گا۔

باہر نکل کر سب سے پہلے شام کا اخبار خریدا۔ فیلکن بینک کے ڈاکے کی خبر شہ سُرخی بن گئی تھی۔ تفصیل دیکھ کر دنگ رہ گیا ایسا لگتا تھا جیسے یہ کارنامہ کسی اور نے انجام دیا ہو اور خود میں شکاگو کے دوسرے باشندوں کی طرح صرف بغلیں بجانے والوں کی صف میں شامل رہا ہوں۔

اخبار کو موڑ توڑ کر جیب میں رکھا اور کیشیئر کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ شکاگو کی کالی صحافت پر سخت غصہ آرہا تھا۔ کمبختوں نے میرا حُلیہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ گنجان داڑھی۔ بڑے بڑے بال اور چنگاریاں برساتی ہوئی آنکھیں جبکہ میں نے خود کو بے حد گلفام سمجھتا ہوں۔ اور تو اور رپورٹر نے میری طرف سے دُھوئیں کا ایک بم بھی پھینک مارا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ غصے میں کیشیئر کو کیا کچھ نہیں کہہ بیٹھا تھا۔ وہ بے چارہ کسی خوش اخلاق برادرِ نسبتی کی طرح دانت نکالے سُنتا رہا پھر بولا "اخبار کے رپورٹر نے اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں لکھا"

"تو پھر یہ کیا بکواس ہے؟ میں نے تو نہایت پُرامن طور پر ڈاکا ڈالا تھا"

"ہمیں امن نہیں چاہیے!" وہ بُرا سا مُنہ بنا کر بولا۔ "اور آپ کا اصل حُلیہ شکاگو کے باشندوں کو متاثر نہیں کر سکتا، معاف کیجیے گا، آپ کی صورت سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بچپن میں والدین کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے ہوں"

"اچھا بس بس!" میں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "فضول باتیں سُننے نہیں آیا۔ دُھوئیں کا بم کب پھینکا تھا میں نے"

"آپ بیٹھیے تو سکون سے۔ ابھی عرض کرتا ہوں!"

"کیا بیٹھوں۔ ایسی بے ایمان صحافت"

"دُھوئیں کا بم آپ کی طرف سے میں نے پھینکا تھا"

"گ... کیوں" میں ہکلا کر رہ گیا۔

"واردات کو بے حد سنگین اور سنسنی خیز بنانے کے لیے"

"خدا کی پناہ"

"کل آپ بینک آف ٹارا ٹیلا پر دھاوا بولیں گے وہاں کے کیشیئر کے نام ایک سفارشی خط لکھ دوں گا"

"کہیں تم لوگ مجھے پاگل تو نہ بنا دو گے"

"ہرگز نہیں، آپ تو ہمارے ہیرو ہیں"

"پھر یہ سفارشی خط؟"

"آپ نے ہم پر احسان کیا ہے اس لیے ہم آپ کے لیے زیادہ سے زیادہ آسانی... فراہم کریں گے۔ لیکن آپ کو اس سلسلے میں بے حد محتاط رہنا پڑے گا"

"وہ کس طرح؟"

"ابھی آپ لوٹ کے مال کو خرچ نہیں کریں گے"

"یہ کیا بات ہوئی"

"ڈاکے ڈال ڈال کر جمع کرتے جایئے"

"بھلا اس سے کیا فائدہ؟"

"شکاگو میں آپ اس دولت کو کبھی استعمال نہ کر سکیں گے ٹھہریے پوری بات سُن لیجیے۔ اسکیم یہ ہے کہ کم از کم ایک کروڑ ڈالر پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ پھر ہم دونوں پوری دولت سمیت میکسیکو کی طرف نکل چلیں جہاں میری خالہ رہتی ہیں، وہاں اُن کی چاندی کی کانیں ہیں ہم بھی اپنا مشترکہ سرمایہ انہی کے کاروبار میں لگا دیں گے اور زندگی بھر عیش کریں گے"

"تجویز بہت عمدہ ہے" میں نے بالآخر کہا۔

"فی الحال آپ ڈکیتی کے علاوہ کیا کرتے ہیں؟"

"یہودیوں کے مذبح میں جانور ذبح کرتا ہوں"

"کتنا معاوضہ ملتا ہے؟"

"سو ڈالر فی ہفتہ"

"مجھ سے سو ڈالر یومیہ لیجیے۔ اُس وقت تک جب تک ہم یہاں سے نکل نہ جائیں"

"اچھا اُن کیشیئرز کا کیا ہو گا جو آپ کے سفارشی خطوط پر ڈاکا ڈالوائیں گے؟"

"آپ بہت ذہین آدمی معلوم ہوتے ہیں جناب"

"شکریہ"

"بات دراصل یہ ہے کہ ہم اُن کیشیئرز کو محض پبلسٹی پر ٹال سکتے ہیں۔ یہاں کون ہے جو اخبارات میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر نہال نہ ہو جاتا ہو۔ وہ اسی لیے آپ سے تعاون کریں گے کہ اُن کی پبلسٹی ہو جائے گی"

"واقعی شکاگو شکاگو ہے"

پھر اُس مردِ معقول نے ٹارا ٹیلا بینک کے کیشیئر کے نام سفارشی خط لکھنا شروع کیا۔

"مائی ڈیئر مسٹر جیمس ہیڈلے چیز!

میں مسٹر عبدالمنان کو ذاتی طور پر جانتا ہوں یہ آپ کے پاس آرہے ہیں۔ براہ کرم ان سے ایک ملین ڈالر کا ڈاکا ڈلوا لیجیے۔ نیز ہفتے کی شام میرے ساتھ گزاریے اور رات کا کھانا کھایئے۔ شکریہ۔

مخلص: پیٹر شینی

اب میں اس ڈاکے کی رُوداد کیا بیان کروں۔ یہ تو پچھلے ڈاکے سے بھی زیادہ سہل ثابت ہوا تھا۔ میں بینک میں داخل ہوا، کیشیئر کو سفارشی خط دیا۔ خط پڑھ کر اس نے بڑے ادب سے کہا۔

"پانچ منٹ بعد جناب... آپ تشریف رکھیے"

پھر کام سے فارغ ہو کر اُس نے بھی نوٹوں کا تھیلا میری گاڑی تک پہنچا دیا تھا۔ اب ملاحظہ فرمایئے اس ڈاکے کی خبر جو اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔

"فیلکن بینک کی طرح بینک آف ٹارا ٹیلا بھی پورے ایک ملین ڈالر سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہاں وہ جیالا چہرے پر ماسک چڑھائے داخل ہوا تھا... لوگ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اس نے ایک چھوٹے سے سلنڈر سے گیس خارج کرنی شروع کر دی... موقع واردات پر موجود لوگوں سے اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ بے ہوش ہو گئے تھے اور کیشیئر نے خود کو اُلٹا لٹکا ہوا پایا تھا"

قصہ مختصر یہ کہ پانچ بینکوں پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد مجھے جے سیکا کی یاد نے ستانا شروع کیا۔

ایک ہفتے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اپنی قیام گاہ کا پتہ اُس نے کبھی نہیں بتایا تھا۔ البتہ میرا پتہ جانتی تھی یہ اور بات ہے کبھی اُدھر کا رُخ بھی نہ کیا ہو۔ ہماری ملاقاتیں عموماً اُسی پب میں ہوا کرتی تھیں۔

بہرحال بُوڑھے یہودی سے مڈبھیڑ ہوئے بغیر اس سے ملاقات نہیں ہو سکتی تھی اور میں اب اُس سے سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ ایک طرح سے میرا رازدار بن چُکا تھا۔ سوچتا اور بور ہوتا رہا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اخبارات میں میرا ذاتی حُلیہ تو سرے سے شائع ہی نہیں ہوا تھا لہٰذا فکر کس بات کی ہے... پب کی طرف چلنا ہی چاہیے۔ ورنہ جے سیکا سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی بُوڑھے یہودی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھر آئے "میں تو سمجھا تھا کہ اب تم اپنی شکل نہیں دکھاؤ گے" اُس نے تنفر سے کہا۔

"کیوں تم کیوں سمجھے تھے؟"

"تدبیر میں نے تمہیں بتائی اور ہاتھ کوئی دوسرا صاف کر گیا"

"ہم... میری ہمت نہیں پڑی تھی"

"صورت ہی سے بزدل معلوم ہوتے ہو... خدا کی پناہ پانچ ملین ڈالر۔ اب بھی موقع ہے۔ اُسی کی آڑ میں تم بھی دو چار بینکوں کو لوٹ لو"

"نہیں بھائی۔ میں قصاب ہی بھلا"

"میں جانتا تھا کہ تم سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ خواہ مخواہ میرا وقت ضائع کرایا"

"کیا اس دوران میں جے سیکا آئی تھی؟"

"میں نہیں جانتا"

"ارے تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے ڈاکہ ڈالنے کی بجائے میں نے دوسری اسکیم بنائی ہے"

"دماغ نہ چاٹو جاؤ۔ بیٹھو جا کر"

"میں جے سیکا کا انتظار کر رہا ہوں"

اُس نے اس طرح شانوں کو جنبش دی جیسے کہہ رہا ہو "جہنم میں جاؤ"

"میں بے حد خوش ہو رہا تھا کہ یہ صورت حرام بھی دھوکا کھا گیا۔ اب بھلا پولیس میرا سُراغ کیوں کر پا سکے گی۔

بیس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ جے سیکا آگئی لیکن بے حد پریشان نظر آتی تھی۔

"ہلو" کہہ کر میری طرف جھپٹی "تم کہاں تھے؟"

"ذرا بیمار ہو گیا تھا"

"اوہ۔ میں کتنی پریشان تھی تمہارے لیے"

لیکن تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ میرے لیے نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے پریشان تھی۔ اس کا بھائی جُوئے میں پانچ سو ڈالر ہار گیا تھا اور جن سے ہارا تھا انہوں نے اُسے روک رکھا تھا۔ دھمکی دی تھی کہ اگر دو دن کے اندر پانچ سو ڈالر ادا نہ کر دیے گئے تو وہ اس پر چوری کا الزام لگا کر پولیس کے حوالے کر دیں گے۔

"اور اب میں اُن تمام لوگوں کو ٹٹولتی پھر رہی ہوں جو مجھ

سے محبت کا دعویٰ رکھتے تھے اور میں نے کبھی اُنہیں گھاس نہیں ڈالی تھی۔" اس نے کہا۔

"اچھا تو پھر" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جھوٹے تھے مردود۔ اگر مجھ سے محبت ہوتی تو بھلا پانچ سو ڈالر کتنی بڑی رقم ہے۔"

"کسی نے بھی نہیں دیے۔" میری آواز میں چہکار تھی۔

"نہیں۔!"

میں نے سوچا فیلکن بینک کے کیشیئر کی ایسی تیسی میں جے سیکا کو ضرور یقین دلاؤں گا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں، بھلا پچاس لاکھ ڈالر میں سے صرف پانچ سو ڈالر کھینچ لینے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟

میں نے جے سیکا سے کہا۔" اب شاید تمہیں میری محبت پر یقین آجائے۔"

"وہ کس طرح اُلّو ڈارلنگ!"

"تمہارے لیے پانچ سو ڈالر ضرور مہیا کروں گا خواہ خود کو بیچ دینا پڑے۔"

"نہیں، تم مذاق کر رہے ہو۔" وہ بے اعتباری سے بولی۔

"اپنا پتہ بتاؤ۔ کل ٹھیک دس بجے صبح پہنچ جاؤں گا۔"

"آج بارہ بجے رات کو مدت ختم ہو جائے گی۔ اس سے پہلے ہی کچھ کرد۔"

"اچھی بات ہے، تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آیا۔"

"میں بھی ساتھ چل رہی ہوں۔"

"نہیں، یہ مناسب نہیں۔"

میں اُسے اپنے فلیٹ میں نہیں لے جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ صرف ایک کمرے کا فلیٹ تھا اور نوٹوں کی گڈیاں میں نے بستر کے نیچے جما رکھی تھیں۔ اس نے بھی اس پر اصرار نہیں کیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر میں نے پانچ سو ڈالر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور اس نے خوشی کے مارے نصف درجن سے زائد نامحرموں کے سامنے مجھے شرمندہ کر کے رکھ دیا۔

پھر وہ اپنے بھائی کا قرض اتارنے چلی گئی تھی اور میں بے حد شاداں و فرحاں اپنے فلیٹ کی طرف چل پڑا تھا۔

وہ رات میرے لیے زندگی کی حسین ترین رات تھی میں نے جے سیکا کا دل جیت لیا تھا اور میرے نیچے پانچ سو کم پچاس لاکھ ڈالر کے نوٹوں کی گڈیاں بچھی ہوئی تھیں۔

ٹھیک دس بجے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے توقع تھی کہ کم از کم آج رات جے سیکا میرے ٹھکانے پر ضرور آئے گی لیکن اس کا خواہشمند نہیں تھا کیونکہ بستر کے نیچے پچاس لاکھ ڈالر...؟

بہر حال، اب تو وہ آ ہی گئی تھی۔ بستر سے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ بلاشبہ وہ جے سیکا ہی تھی لیکن اس کے پیچھے دو باوردی پولیس والوں کو دیکھ کر میری رُوح فنا ہو گئی۔ دفعتاً جے سیکا چیخی۔" وہ نوٹ اسی نے مجھے دیا تھا۔"

"کک... کیسا نوٹ!" میں ہکلایا۔" مم۔ میں... نہیں جانتا کہ تم کک... کون ہو۔"

پھر معلوم نہیں، کیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا ہوں گا۔

❖

علاقے کے پولیس اسٹیشن کا انچارج مجھے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا اور میری عقل گم گئی تھی۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے ایسے ہی موقعے کے لیے بچاؤ کی تدبیر بھی تو سوچ رکھی تھی۔

جی کڑا کر کے ہنس پڑا۔

"کیا مطلب۔" آفیسر آنکھیں نکال کر بولا۔" پاگل پن کا ڈھونگ نہیں چلے گا۔"

"حضور میں بہروپیا ہوں۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"سوانگ بھرنے والا۔ ہمارے اجداد اپنے بہروپوں کی بنا پر راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور بادشاہوں کے درباروں سے انعام پاتے تھے۔ آپ نے خوب قدر افزائی فرمائی کہ تھانے میں پکڑوا بلوایا۔"

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ وہ سارے نوٹ تمہارے پاس کس نے رکھوائے تھے؟"

"فیلکن بینک کے کیشیئر نے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔"

"تفصیل سے عرض کرتا ہوں۔ ہم بہروپیوں میں رسم ہے کہ خواہ کتنی ہی بڑی پوزیشن پر پہنچ جائیں، برکت کے لیے کبھی کبھی بہروپ بھی بھرتے رہتے ہیں۔ ہماری طرف کے کسی بھی آدمی سے آپ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہم بہروپیوں کے اجداد بادشاہوں کے جی خوش کیا کرتے تھے اور اب چونکہ سلطانی جمہور کا زمانہ ہے اس لیے بہروپیوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے حضرات جمہور کا بھی جی خوش کرنے سے نہیں شرماتے۔ یقین نہ آئے تو ہماری پچیس سالہ تاریخ پر نظر ڈال کر اطمینان کر لیجیے۔ زیادہ نہیں تو سال میں ایک بار ضرور بہروپ بھرتے ہیں۔ برکت کے لیے۔ سو حضور عالی اس ناچیز نے یہی رسم نبھانے کے لیے ڈاکو کا بہروپ بھر کر فیلکن بینک میں قدم رکھا تھا۔ خیال تھا کہ جب وہاں کے لوگ بہت زیادہ نروس ہو جائیں تو ایک زوردار قہقہہ لگا کر انہیں اپنی حقیقت سے آگاہ کر دوں گا۔ اچھا یہ بتایئے، میرے فلیٹ سے برآمد ہونے والا پستول کیا محض ایک کھلونا نہیں ہے؟"

"ہاں وہ تو ہے۔ تم اپنا بیان جاری رکھو۔"

تو پھر یہ ہوا جناب کہ اپنی حقیقت کا اظہار کرنے سے پہلے ہی کیشیئر نے ایک ملین ڈالر کا تھیلا میرے ہاتھ میں تھما کر کہا "بھاگ جاؤ اور شام کو میرے گھر پر آنا..."

داستان کے اس حصے پر پہنچ کر میں نے سچ بولنا شروع کر دیا اور سارے واقعات اسی طرح بیان کیے جیسے پیش آئے تھے۔

میرے خاموش ہونے پر آفیسر نے اپنا سر پیٹ لیا۔ پھر بولا۔" سب چوپٹ کر دیا مردودوں نے... اچھا یہ بتاؤ کہ تم اپنے اسی بیان پر قائم رہو گے؟"

"کیوں نہیں؟ اگر ایسا نہ ہو تو میرا سر اُڑا دیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے! میں تمہیں سرکاری گواہ بنانے جا رہا ہوں اس لیے تم بے داغ بَری کر دیے جاؤ گے اور مقدمے کے دوران میں تمہیں وہ تمام سہولتیں ملیں گی جو سرکاری گواہوں کو ملتی ہیں!"

اب سُنیے اصل قصہ کیا تھا جو مقدمے کی کارروائی کے دوران میں معلوم ہوا۔ سال ڈیڑھ سال پہلے مقامی انتظامیہ نے بینک کے ڈاکوؤں سے نپٹنے کے لیے ایک اسکیم مرتب کی تھی جس کے تحت کروڑوں ڈالر کے جعلی نوٹ خاص قسم کی دوہری تجوریوں میں رکھ کر بینکوں کے حوالے کر دیے گئے۔ ڈاکو خزانچیوں سے تجوری کھولنے کو کہتے اور وہ نقلی نوٹوں والی تجوری کھول دیتے۔ ڈاکو جعلی نوٹ سمیٹ لے جاتے اور انہیں استعمال کرتے ہوئے یقینی طور پر دھر لیے جاتے جب ڈاکوؤں نے محسوس کیا کہ خود اُن کے ساتھ فراڈ کیا جا رہا ہے تو وہ محتاط ہو گئے اور زنگاگو کے باشندے سنسنی کو ترسنے لگے۔ بہر حال، اب وہ پانچوں کیشیئر بھی میری طرح جیل میں تھے جنہوں نے از راہِ انسانیت مجھ غریب الوطن سے اپنے بینک لٹوائے تھے —

انہیں بیس بیس سال کی سزا ہوئی اور میں بَری کر دیا گیا۔

پولیس آفیسر میری پیٹھ تھپکتا ہوا اپنے دفتر میں لایا اور بولا۔ "اب تم جے سیکا سے شادی کر لو۔ کیونکہ اسی نے تمہاری جان بچائی ہے۔"

"اب اس خرافات کی بات نہ کیجیے۔"

"اگر وہ تم سے نوٹ لے جا کر بھنانے کی کوشش نہ کرتی تو تمہاری ہڈیوں تک کا پتہ نہ چلتا۔"

"وہ کس طرح؟"

"بالکل ڈیوٹ ہو گیا۔ ابھی تک معاملہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟"

"جی نہیں، میں بالکل نہیں سمجھا جناب!"

فیلکن بینک کا کیشیئر تمہارے تعاون سے سارے بینکوں سے جعلی نوٹ نکلوا لیتا اور پھر انہیں ایک گاڑی میں بھر کر تمہارے ساتھ میکسیکو فرار ہو جانے کا ڈراما اسٹیج کرتا پھر ایک جگہ اُسے پیشاب کی حاجت ہوتی، وہ تم سے گاڑی روکنے کا کہہ کر خود نیچے اترتا اور دور چلا جاتا اور تم جعلی نوٹوں سمیت بھک سے اُڑ جاتے۔"

"کک... کیا مطلب؟" میرے سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔

"نوٹوں کے ڈھیر کے نیچے ایک ٹائم بم پوشیدہ ہوتا... اور کیشیئر بم پھٹنے سے پانچ منٹ پہلے گاڑی سے اُترتا۔"

"لیکن۔ لیکن آخر کیوں؟"

"وہ جعلی نوٹوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے تاکہ دوبارہ بینکوں میں ڈاکے پڑنے لگیں... اب یہ حقیقت ہم پر واضح ہوئی ہے کہ بینکوں کے منیجر اور کیشیئر ڈاکوؤں سے چالیس فیصد کمیشن پر سودا کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی ڈاکوؤں کی گرم بازاری کی... ہاں تو تم نے جے سیکا سے شادی کے بارے میں کیا سوچا۔ تم خود فیصلہ کرو کیا اُسی نے تمہاری جان نہیں بچائی تھی۔"

"بالکل بالکل۔ میں نے سر ہلا کر کہا۔ لیکن میں ایسی مقدس ہستی سے شادی جیسی بدتمیزی کرنے کی جرأت نہیں رکھتا۔ البتہ دیوی سمجھ کر زندگی بھر پوجتا رہوں گا۔"

اور اپنے وعدے کے مطابق میں اسے پوجے جا رہا ہوں۔

قابلِ اعتراض تصویر
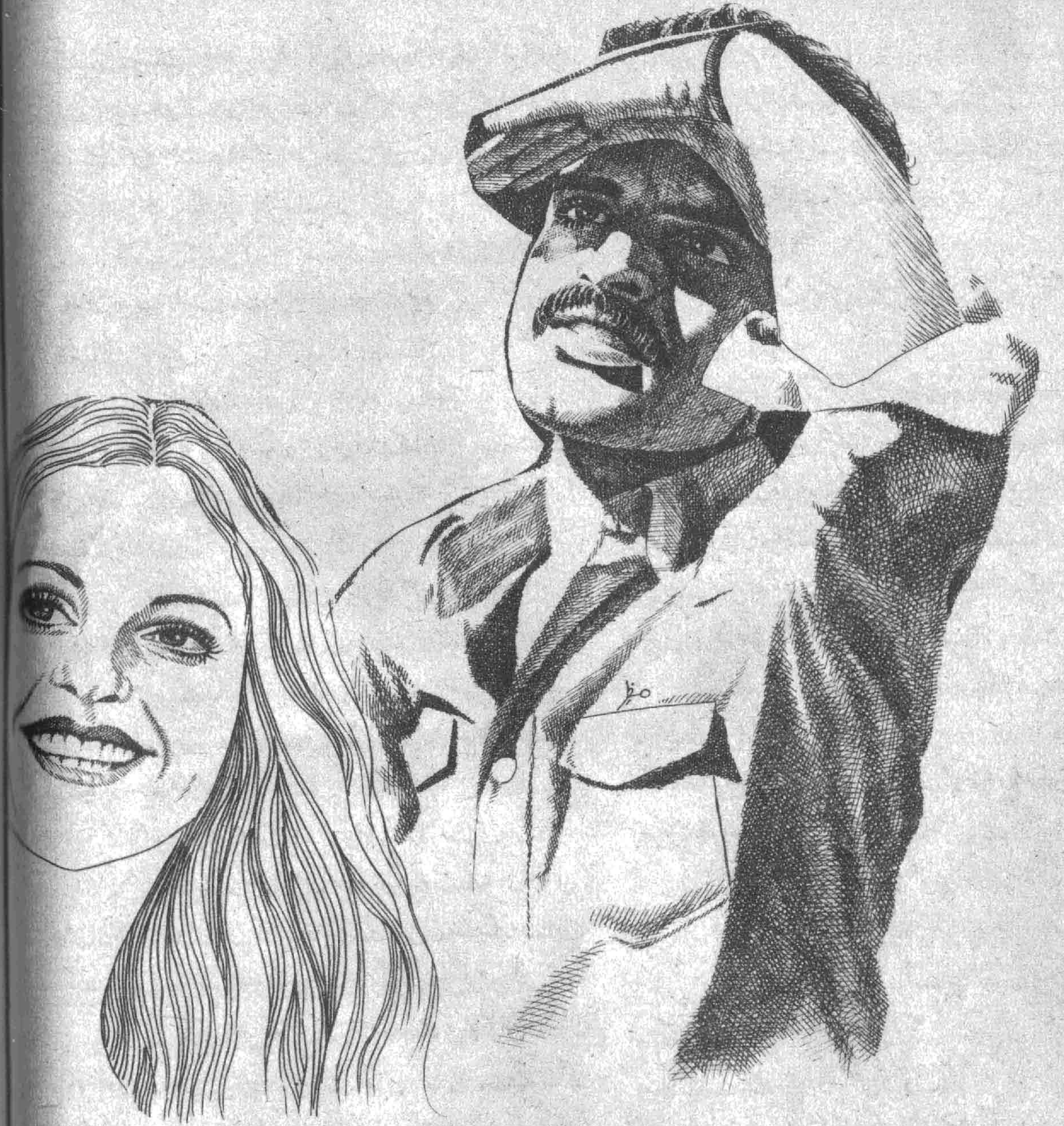
ابنِ صفی

کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کی اس کہانی میں دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ کہانی آپ کو کیپٹن حمید سنا رہے ہیں۔

آج میں کیپٹن حمید آپ سے مخاطب ہوں۔ اگر نہ ہوتا تب بھی یہ کہانی آپ تک پہنچ ہی جاتی۔ میں کیوں بیان کر رہا ہوں اس کا اندازہ بھی آگے چل کر آپ کو ہو ہی جائے گا۔ آپ تو مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک دن مجھے بڑی ہی حیرت انگیز اطلاع ملی، ہائی سرکل کلب کے حلقۂ احباب سے معلوم ہوا کہ ایک صاحبہ میرے "ظلم اور بے مروّتی" کی کہانی سناتی پھر رہی ہے۔ نام پوچھا تو میرے لیے بالکل نیا نکلا۔ میں اس نام کی کسی ایسی خاتون سے کبھی واقف نہیں رہا تھا... جو میری بے وفائی کے تذکرے میرے احباب میں کرسکتیں۔ بہرحال اشتیاق بڑھا۔ اسی شام ہائی سرکل جا پہنچا اور ایک بے تکلف دوست کی وساطت سے انہیں دور سے دیکھنے کا شرف بھی حاصل کیا۔ وہ توقعات سے کچھ زیادہ ہی خوبصورت نکلیں۔ گداز جسم اور موزوں قدوقامت کی خاتون تھیں۔ چہرہ بھی دل کش تھا۔ عمر ستائیس، اٹھائیس سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ ان کے چہرے

کی دلکشی کا باعث، دراصل ان کی مغموم آنکھیں تھیں اور ان کی پوری شخصیت ان آنکھوں ہی کے تابع محسوس ہوتی تھی۔ ایسا جیسے میرؔ کا کوئی نازک سا شعر انسانی پیکر اختیار کر کے آنکھوں کے سامنے آگیا ہو۔

میں نے مصلحتاً اپنے دوست سے کہہ دیا کہ ہاں میں ان سے کسی قدر واقف ہوں اور ان محترمہ کے سامنے گئے بغیر وہاں سے رخصت ہوگیا۔ ذہن پر بہت زیادہ زور دینے کے باوجود بھی یادداشت کا کوئی گوشہ ان کے متعلق روشنی میں نہ آسکا "پھر کیا چکر ہے" میں نے سوچا... تھوڑی دیر بعد پھر مجھے ہائی سرکل ہی میں واپس آنا پڑا لیکن معمولی قسم کے میک اپ میں۔ شہرزاد صاحبہ اب بھی اسی ٹیبل پر موجود تھیں۔ ان کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا کافی کے خالی برتن میز پر رکھے ہوئے وہ کسی رسالے کا مطالعہ فرما رہی تھیں۔

میں نے اپنے لیے ان کے قریب ہی ایک میز منتخب کی۔ صورت سے نیک سیرت ہی لگ رہی تھیں، وہ محترمہ... میں ان کے بارے میں کوئی بُری بات نہ سوچ سکا لیکن آخر اس فراڈ کا کیا مطلب تھا۔ مجھے خوامخواہ کیوں بدنام کرتی پھر رہی ہے یہ بھی ممکن تھا کہ میں ان کی پھیلائی ہوئی افواہوں سے متاثر ہو کر اُن کا تعاقب شروع کر دیتا۔ ممکن ہی نہیں تھا بلکہ یہ میرا فطری ردِ عمل ہونا چاہیے تھا۔

بہ چلیے میں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ پھر؟... کچھ نامعلوم آدمی ان محترمہ کو چارا بنا کر مجھے شکار کرنا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب میرے لاشعور نے اثبات ہی میں دیا اور پھر میں نے کہا دیکھ ہی لینا چاہیے اس معاملے کو بھی...

کچھ دیر بعد وہ اٹھ گئیں۔ میں ان کے پیچھے تھا۔ باہر آکر انہوں نے ایک ٹیکسی رکوائی اور وہاں سے روانہ ہوگئیں۔ اس بار میں اسکوٹر لے کر آیا تھا۔ لہٰذا تعاقب جاری رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اُس کی ٹیکسی... ہوٹل ڈی فرانس کے سامنے رُکی تھی اور میں نے تعاقب جاری رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں رفیعہ شہرزاد کے نام سے مقیم ہیں۔ اس تعاقب کے دوران میں کئی بار میں نے ایسے طریقے اختیار کیے تھے جن سے ظاہر ہو جاتا کہ میں اس عورت کا تعاقب کر رہا ہوں۔ لیکن خود میں نے کسی بھی جگہ محسوس نہیں کیا تھا کہ کوئی میرا تعاقب بھی کر رہا ہے۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں زیادہ محتاط آدمی نہیں ہوں۔ سوچ بچار ضرور کرتا ہوں لیکن اس قدر بھی نہیں کہ سوچ بچار ہی کرتا رہ جاؤں۔ بس تھوڑا سوچا اور لگ گئے کام سے۔ اتنی تاب کہاں ہے کہ کسی معاملے سے الگ رہ کر اس کے مزید روشنی میں آنے کا انتظار کرسکوں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عادت سے مجبور ہو کر تھوڑی ہی دیر بعد اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے بیٹھا۔

دروازہ پورا کھلنے پر وہ سامنے کھڑی نظر آئی، شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہن کر اس کی ڈوری کس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار دیکھ کر میں نے کہا "تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں لیکن ضروری بات ہے!"

اس نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا "اندر تشریف لایے۔"

اندر پہنچ کر میں نے خود ہی ایک کرسی کھینچ لی، اُس کے کہنے کا منتظر نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے اب بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھے جا رہی تھی۔ "آپ بھی بیٹھ جایے۔" میں نے اس سے کہا۔

"ج ج.... جی شکریہ۔" وہ بستر پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "م.... میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"پہچاننا آپ کے لیے ضروری نہیں جبکہ جان پہچان کے بغیر ہی آپ دوسروں سے متعلق افسانے تراش سکتی ہیں۔"

"اوہ...... کیپٹن حمید....." وہ اُچھل کر کھڑی ہوگئی

"اگر میں کیپٹن حمید ہوں تو آپ کی پھیلائی ہوئی کہانیاں کس حد تک سچ ہوسکتی ہیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"آپ نہیں ہیں!" دفعتاً اُس کی آواز کمزور پڑ گئی۔

"پہچاننے کی کوشش کیجیے۔"

"میں آپ سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کیپٹن حمید ہیں یا نہیں؟" اس نے کسی قدر غصیلے لہجے میں کہا۔

"جی نہیں!"

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" وہ مضمحل آواز میں بڑبڑائی۔

"آپ کیا نہیں سوچ سکتی تھیں؟"

"کچھ نہیں...... براہ کرم یہاں سے تشریف لے جایے!"

"لیکن محترمہ آپ جواب دہی سے نہیں بچ سکیں گی،

آپ نے ایک پولیس آفیسر کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے محکمے میں عشق و محبت اور سوز و گداز وغیرہ نہیں چلتے اگر آپ ناکام محبت ہیں اور کیپٹن حمید نے آپ سے بے وفائی کی ہے تو یہ اس کا نجی معاملہ ہے۔ اسے بدنام کر کے آپ اس کی پوزیشن کو متزلزل نہیں کر سکتیں۔ وہ ایک کھلنڈرا آدمی ہے سب اس سے واقف ہیں۔ اس کے ماتحت بھی اور اس کے افسر بھی...!"

"وہ قطعی کھلنڈرا آدمی نہیں۔" رفیعہ تلخ لہجے میں بولی۔ "ورنہ تمہیں بھیجنے کی بجائے خود آتا۔"

"بھلا وہ کیوں آتا جبکہ آپ اسے پہچانتی تک نہیں"

"آپ ہیں نا...؟" ..... اللہ بتا دیجئے.....!"

یک بیک وہ ٹھٹکی۔

"فرض کیجیے میں ہی ہوں تو پھر؟"

"مجھے اس پر یقین ہونا چاہیے کہ آپ ہی ہیں" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی بولی۔

آخر کچھ دیر بعد یقین دلا ہی دینا پڑا کہ میں ہی کیپٹن حمید ہوں۔

"میں نے سنا ہے آپ ضرورت مندوں کی مدد بھی کرتے ہیں اور ان کے معاملات کو اپنی ذات تک محدود رکھتے ہیں۔"

میں نے اسے بتایا کہ اس نے غلط نہیں سنا۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر غمگین آواز میں بولی "آپ کے سلسلے میں مجھے بھی بہت زیادہ سراغ رسانی کرنی پڑی ہے۔" اور اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کی "یہ پتہ لگانا کہ آپ کن حلقوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں اور کہاں کہاں آپ سے متعلق اس قسم کی گفتگو کرنا مناسب ہوگا، مشکل کام تھا۔"

"میں کہتا ہوں اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ براہ راست مجھ تک پہنچ کر کسی بھی معاملے میں مدد کی طالب ہو سکتی تھیں۔"

"میں بہت دشواری میں پڑ گئی ہوں۔ اس شہر میں مجھے کوئی بھی نہیں جانتا۔"

"آپ دشواری بیان کیجیے!"

"دشواری بیان نہیں کر سکتی! سب کچھ آپ کے حوالے کر کے آپ کو معاملات کی نوعیت کا اندازہ کرنے کی مہلت دوں گی۔"

"کیا حوالے کر کے؟"

"ٹھہریے!" وہ اٹھتی ہوئی بولی۔ اس کے بعد اس نے مسہری کے نیچے سے ایک سوٹ کیس نکالا اور اسے کھولنے لگی۔ میں سوٹ کیس کی طرف سے توجہ ہٹا کر پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ سوٹ کیس بند کر کے وہ میرے قریب آئی اور ایک لفافہ میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی "اسے آپ یہاں میری موجودگی میں نہیں دیکھ سکتے۔ جیب میں رکھ لیجیے۔ کہیں اور جا کر دیکھیے گا۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔" میں نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ لفافہ بند تھا اور اس پر کسی قسم کی کوئی تحریر نہیں تھی۔ دفعتہً وہ میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئی مسکرائی اور بولی "سراغ رساں صاحب! اس لفافے میں ٹائم بم تو ہو نہیں سکتا۔ براہ کرم اسے احتیاط سے جیب میں رکھ لیجیے۔ گھر جا کر دیکھیے گا کہ آپ میرے لیے کیا کر سکیں گے، اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔"

"تو اب میں جاؤں؟" میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا اور اس نے بھی بے وقوفوں کی طرح سر ہلا کر کہا۔

"جی ہاں!"

...اور آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ میں چپ چاپ اٹھ کر چلا آیا تھا۔ یہ بھی بڑی عجیب بات تھی کہ میں نے راستے میں کہیں رک کر اس لفافے کو کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی سیدھا گھر ہی آیا تھا۔ اس لفافے میں اسی کے بیان کے مطابق ٹائم بم تو نہیں تھا لیکن مجھ جیسے آدمی کے لئے وہ چیز ہائی ایکسپلوسیو بم سے کسی طرح کم ثابت نہ ہو سکی۔ یہ ایک فوٹو گراف تھا۔ اس میں رفیعہ شہر زاد اور ایک مرد قابل اعتراض ہی نہیں بلکہ ناگفتہ بہ حالات میں نظر آئے۔ اس زور کا غصہ آیا کہ بس کیا بتاؤں پھر خیال آیا کہ تصویر کے ساتھ کچھ کاغذات بھی تو ہیں انہیں بھی دیکھا جائے اگر ان میں بھی لغویات نظر آئیں تو جی بھر کر خفا ہو لیا جائے گا۔

یہ کئی صفحات پر مشتمل ایک تحریر تھی جس کا ماحصل یہ تھا کہ فوٹو حقیقی نہیں تھے لیکن شریک مرد اس کے لیے اجنبی بھی نہیں ہے اور وہ اس کا مرحوم چچا زاد بھائی ہے اور اس کے لیے اتنا ہی محترم تھا جتنا سگا بھائی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں نے کچھ عرصہ لندن میں ایک ساتھ گزارا تھا۔ اب جبکہ وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اسے یہ تصویر اس دھمکی کے ساتھ موصول ہوئی ہے کہ اگر اس نے اپنا ارادہ نہ بدلا تو اس

تصویر کی ایک کاپی متعلقہ آدمی کو بھیج دی جائیگی۔ آخر میں شہر زاد نے لکھا تھا:

"اس تصویر کو آپ تک پہنچا دینے کے بعد پھر آپ سے آنکھیں ملانے کی جرأت خود میں نہیں پاتی لیکن بہرحال مجھے اس پریشانی سے نجات حاصل کرنی ہے۔ خدارا کچھ کیجیے۔ میں ایک بار پھر یقین دلاتی ہوں کہ یہ تصویر فوٹوگرافی کی بازی گری کے علاوہ اور کوئی اصلیت نہیں رکھتی۔ ہم دونوں کے سر انجانے جسموں سے جوڑ دیے گئے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے لاکھوں منتوں اور سماجتوں کے ساتھ لکھا تھا کہ اس بلیک میلر سے اسے نجات دلائی جائے میں نے لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ کرنل صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ اس لیے بڑے اطمینان سے تجربہ گاہ میں کام کر سکتا تھا۔ ذرا سی دیر میں، میں نے رفیعہ کے بیان کی تصدیق کر لی، تصویر حقیقتہً بنائی ہوئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس کا نیگٹو کسی پازیٹو سے بنایا گیا تھا۔ میں نے ہوٹل ڈی فرانس سے فون پر رابطہ قائم کر کے رفیعہ کے کمرے میں کنٹیکٹ کرایا اور اسے اطلاع دی کہ میں یقیناً اس کی مدد کروں گا کیونکہ تصویر سے متعلق اس کا بیان صداقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اس نے جواب میں میرا شکریہ ادا کر کے مزید کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا حالانکہ میں ابھی اس سے کچھ دیر باتیں کرنا چاہتا تھا۔

دوسری صبح میں پھر ہوٹل ڈی فرانس جا پہنچا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھی۔ کاؤنٹر پر معلوم ہوا کہ وہ ایک گھنٹہ پہلے اپنا حساب صاف کر کے کمرہ خالی کر گئی ہے۔ بات پلے نہ پڑی وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھ کر واپس گھر آیا۔ کرنل صاحب دفتر جا چکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا۔ ان سے اس واقعے کا تذکرہ کروں یا نہ کروں..... ! تصویر اور تحریر میرے قبضے میں تھی۔ آخر وہ اس طرح غائب کیوں ہو گئی؟ اگر اس کی کہانی سچی تھی تو ابھی اسے اور بھی بہت کچھ بتانا تھا۔ محض کہانی کی حد تک تو کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آخر میں کس کے گریبان میں ہاتھ ڈالتا۔ دوسرا دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا کہ اس کا تذکرہ کرنل سے کیا جائے یا نہیں۔

شام کو پھر میں نے ہائی سرکل نائٹ کلب کی راہ لی میں ان لوگوں سے اس کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا جن کے ساتھ وہ اٹھتی بیٹھتی رہی تھی۔ وہ مجھے ان کے درمیان موجود ملی لیکن میں نے اس میز کی طرف جانے کی بجائے اپنے لیے ایک خالی میز منتخب کی۔ رفیعہ شہر زاد کے علاوہ اس میز کے اور سب لوگ مجھے گھور رہے تھے۔ وہ بھلا کیوں کر متوجہ ہو سکتی تھی۔ میں پچھلی رات والے میک اپ میں تو تھا نہیں۔ میری اصلی شکل میں تو وہ مجھے پہچان ہی نہیں سکتی تھی۔ میں منتخب کی ہوئی میز پر جانے کے لیے ان کے قریب سے گزر ہی رہا تھا کہ بیگم نوشاد نے "ہلو کیپٹن" کہہ کر مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ میں رک گیا۔ میں نے سوچا رفیعہ کی آزمائش کے لیے ایک موقع اور ہاتھ آیا۔ بیگم نوشاد نے کہا کہ میں بھی انھیں کے ساتھ بیٹھوں اور ویٹر کو اشارہ کر کے ایک کرسی اور منگوائی۔ دوسروں کو اپنی کرسیاں کھسکا کر میرے لیے جگہ بنانی پڑی۔ میں نے رفیعہ کی طرف دیکھا وہ بے تعلقانہ انداز میں بیٹھی رہی۔ بیگم نوشاد کبھی میری طرف دیکھتی تھیں اور کبھی رفیعہ کی طرف۔ دفعتہً انہوں نے کہا۔

"اب یہ بے تعلقی ختم ہونی چاہیے۔"

میں نے سوچا کھیل بگڑ جائے گا لہٰذا جلدی سے بول پڑا "بے تعلقی میری طرف سے نہیں ہے بیگم نوشاد، رفیعہ نے خود ہی مجھے ٹھکرایا تھا!" وہ چونک کر مجھے گھورنے لگی۔ میں نے مسکرا کر کسی قدر تلخ لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی "آپ خود دیکھیے ان کی آنکھوں میں کتنی اجنبیت ہے جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔ حالانکہ کیپٹن حمید کو اگر کسی نے ایک بار بھی دیکھا ہے تو وہ اسے بھلا ہی نہیں سکتا۔"

"آخر جھگڑا کیوں ہوا تھا؟" بیگم شمشاد نے پوچھا۔

"اب جبکہ یہ مجھے برا بھلا کہتی پھر رہی ہیں۔ مجھے بھی کچھ کہہ دینا چاہیے۔ ہم بڑے اچھے دوست تھے۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ ڈیڈی میری شادی اپنے بھتیجے سے کرنا چاہتے ہیں اور وہ بڑا شکی آدمی ہے۔ اس لیے اب ہم نہیں ملیں گے۔" میں نے کہا "ٹاٹا..... میرے نکتہ نظر سے دوسری بار تو پیدا ہونا نہیں ہے کہ ایک ہی دوستی پر اکتفا کیے بیٹھا رہوں، دوستی ایک ہمہ گیر جذبہ ہے اور کسی ایک کے لیے مخصوص نہیں۔ میں مٹی کے ڈھیر سے دوستی کر کے نبھا سکوں گا۔" میں نے دیکھا کہ رفیعہ کے چہرے پر مردنی چھا گئی ہے۔ اس لیے جلدی سے بولا، "اگر یہ دوستی کا رشتہ دوبارہ قائم کرنا چاہتی ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" پھر میں نے اٹھ کر رفیعہ کا ہاتھ پکڑا اور بے تکلفانہ انداز میں بولا "آؤ چلیں۔" وہ کسی سحر زدہ کی طرح اٹھ گئی تھی میں ان سبھوں کو متحیر چھوڑ کر اسے ساتھ لیے ہوئے باہر آ گیا۔ آج

لنکن تھی میرے پاس۔ میں نے اگلی سیٹ کا دروازہ رفیعہ کے لیے کھولتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ، بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"م..... مگر..... میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" وہ ہکلائی۔

"کیپٹن حمید ـــــ جس نے آپ سے بے وفائی کی تھی۔"

"ل..... لیکن.....!"

"چلو بیٹھ جاؤ۔ پچھلی رات میں میک اپ میں تھا کیا تم آواز سے بھی نہیں پہچان سکتیں۔" پھر میں بھی بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "صبح سے تمہاری تلاش میں تھا۔" کچھ دور چلنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی مطمئن نہیں ہے۔ "تصویر کے بارے میں۔ میں تمہیں رات ہی اطلاع دے چکا ہوں۔"

"جی ہاں اور اب اس کا تذکرہ نہ کیجیے۔"

"اب بتایئے! کوئی ایسا آدمی ہے جس پر آپ شبہ کر سکیں۔"

"ہم کہاں جا رہے ہیں۔" اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

"کہیں بھی نہیں، میں نے تو آپ کو وہاں سے اس لیے اٹھایا تھا کہ کچھ دیر گفتگو رہے اور اس کے لیے گاڑی سے زیادہ مناسب جگہ نہیں۔ ویسے اگر تم کہیں چلنا چاہو!"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" اس نے کہا۔ بہت نروس معلوم ہو رہی تھی! تھوڑی دیر گفتگو کے بعد پتہ چلا کہ ہوٹل ڈی فرانس میں کسی شناسا کو دیکھ کر اس نے فوری طور پر وہاں کی رہائش ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مزید پوچھ گچھ پر وہ شخص اس کا قریبی شناسا ثابت ہوا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُسے شہر میں اس کی موجودگی کا علم ہو۔ میں نے اس سے اس شناسا کا نام معلوم کیا۔ اب لنکن کا رُخ ہوٹل ڈی فرانس کی طرف تھا۔ عمارت کے سامنے پہنچ کر وہ گڑبڑا گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ گاڑی ہی میں بیٹھی رہے اور خود نیچے اُتر گیا۔ اندر کاؤنٹر پر اس کے شناسا کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ وہ کمرہ بیاسی میں مقیم تھا تصدیق کر کے میں واپس آ گیا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ ہم پھر چل پڑے۔ اس نے بتایا کہ وہ اب گرینڈ میں مقیم ہے۔ میں نے کہا اگر وہ چاہتی ہے کہ میں اس کی مدد کروں تو مجھے اطلاع دیے بغیر رہائش تبدیل نہ کرے۔ گرینڈ تک پہنچتے پہنچتے میں نے اس سے بہت سی باتیں کر ڈالیں لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایسی باتوں کا جواب دینے سے گریزاں ہے جن سے اس کی شخصیت یا خاندان پر روشنی پڑ سکتی۔

بڑا ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ بہتیری ضروری معلومات حاصل کیے بغیر اس سلسلے میں کام کا آغاز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو مشتبہ آدمیوں کی فہرست تیار کرنی پڑتی پھر یہ دیکھنا پڑتا کہ ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اس حد تک جا سکے۔ میں نے ... اُسے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے گرینڈ کے قریب اُتار دیا اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ میں وہ تصویر کرنل صاحب کی خدمت میں پیش کر دوں اور اس وقت تک اس کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں جب تک کہ وہ مجھے قتل کر دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

شامت میری منتظر تھی! وہ شاید خواب گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے تصویر ان کی طرف بڑھا دی۔ اچٹتی سی نظر ڈالی اور میرا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولے "کیا بیہودگی ہے"؟

تصویر میرے ہاتھ سے گر گئی تھی اور وہ آگے بڑھ گئے تھے پھر میں تصویر اٹھا ہی رہا تھا وہ دوبارہ پلٹ آئے۔ اب جو میں تصویر اٹھا کر سیدھا ہوا تو ان کی خونخوار نظروں سے دوچار ہونا پڑا۔ انہوں نے مجھے اسی طرح گھورتے ہوئے تصویر میرے ہاتھوں سے جھپٹ لی اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں کھڑا احمقوں کی طرح انہیں دیکھتا رہا۔ اب وہ اس طرح اس تصویر کو گھور رہے تھے جیسے ان دونوں میں سے کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد پھر انہوں نے میری طرف دیکھا اور بولے۔

"اگر میں تمہارا خیال کرتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میرے مُنہ پر تھوکنے کی کوشش کرو۔"

ان کا لہجہ عجیب تھا اور میرے لیے نیا بھی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی؟ چھٹی حس نے کہا بات کو طول نہ دو۔ لہٰذا لفافہ بھی میں نے ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک کیس ہے۔ تحریر دیکھ لینے کے بعد ہی میرے متعلق کوئی رائے قائم فرمایئے گا۔"

وہ لفافہ میرے ہاتھ سے لے کر تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنی خواب گاہ کی طرف چلے گئے۔ میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہا اور پھر تھوڑی دیر بعد مجھ پر دوسرا بم گرا تھا۔ میری خواب گاہ کے فون کی گھنٹی بجی، ریسیور اُٹھایا تو دوسری طرف سے کرنل صاحب ہی کی آواز سُنائی دی۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں طلب کر رہے تھے۔ کمرے میں پہنچا تو وہی تصویر ان کے ہاتھ میں تھی اور ایک البم سامنے میز پر کھلا پڑا تھا۔

"تمہارے بیان کے مطابق وہ لڑکی گرینڈ ہوٹل میں مقیم تھی لیکن کمرہ نمبر تیرہ سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔" انہوں نے مجھے دیکھتے ہی غصیلے انداز میں کہا اور ٹیلی فون کو گھورنے لگے۔

میں نے کہا "میں ٹرائی کرتا ہوں۔" لیکن مجھے بھی آپریٹر نے یہی جواب دیا کہ کمرہ نمبر تیرہ سے کوئی جواب نہیں مل رہا.....

"میں چلوں گا۔ کپڑے پہنو!" کرنل صاحب مجھے گھورتے ہوئے بولے۔

ہم گرینڈ پہنچے اور سیدھے کمرہ نمبر تیرہ کی طرف بڑھتے چلے گئے، پتہ نہیں کیوں کرنل نے کاؤنٹر پر رُک کر کسی قسم کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کمرے کے سامنے جا کر رُکے۔ دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ کھلتا ہی چلا گیا۔ پورا کمرہ تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا اور وہ سامنے ہی مسہری پر سو رہی تھی۔ کرنل نے دروازہ بند کر دیا اور ہم دروازے کے قریب ہی کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ دفعتہً کرنل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "وہ مر چکی ہے اور تم خطرے میں ہو۔"

میں بوکھلاہٹ میں مسہری کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہ واقعی مر چکی تھی اور شاید اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ میں نے کمبل ہٹانا چاہا لیکن کرنل نے ہاتھ اٹھا کر اس سے باز رکھا اور مجھے کمرے سے نکال لائے۔ اس سے پہلے انہوں نے تیز روشنی والا بلب بجھا کر گہری نیلی روشنی والا بلب روشن کر دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ وہ مجھے بدنام کرتی رہی تھی اور آج شام کو میں کئی لوگوں کے سامنے اسے سرکل سے اُٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ لنکن میں بیٹھتے ہوئے میں نے کرنل سے اپنی اُلجھن کا تذکرہ کیا۔ وہ سرد لہجے میں بولے۔ "اسی لیے یہ ضروری ہے کہ لاش دریافت ہونے سے قبل ہی ہم قاتل پر ہاتھ ڈال دیں۔"

"ق ـــــ قاتل ـــــ اسے ہم کہاں تلاش کریں گے؟"

"تم نے ہوٹل ڈی فرانس میں اس کے کسی شناسا کا تذکرہ کیا تھا؟"

"ہاں میں نے تصدیق کی تھی۔ کمرہ نمبر بیاسی میں طارق سعید نام کا ایک آدمی مقیم ہے۔"

"طارق سعید!" کرنل صاحب کی آواز میں دبا دبا سا جوش بھی شامل تھا۔ میں چونک کر ان کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ ہم ہوٹل ڈی فرانس پہنچے ..... رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ آج سردی بھی کسی قدر زیادہ ہی تھی۔ ہم لفٹ کے ذریعے تیسری منزل کے کوریڈور میں پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے ایک آدمی آتا نظر پڑا۔ اس نے اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور فیلٹ کا گوشہ پیشانی پر اس طرح جھکا رکھا تھا جیسے مقصد ہی چہرہ چھپانا ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ کرنل نے اپنی رفتار کم کر دی ہے اور جیسے ہی وہ آدمی قریب سے گزرا کرنل ایک قدم پیچھے ہٹ کر، اس کے سامنے آتے ہوئے بولے "اوہ انکل" وہ ایک جھٹکے کے ساتھ رُکا تھا، ساتھ ہی فیلٹ ہیٹ کا گوشہ بھی اوپر کر لیا تھا۔ میں نے ایک جھینپا جھینپا سا قہقہہ سُنا جس میں اعصابی تشنج کے اثرات بھی شامل تھے۔

"کیا یہ ظلم نہیں ہے انکل کہ آپ یہاں آ کر ہوٹل میں قیام کریں...!" کرنل پھر بولے۔

"بھئی کیا بتاؤں کمال میاں! ایسی مصروفیات ہوتی ہیں کہ کسی کے یہاں مہمان بننے کو جی نہیں چاہتا۔" کرنل کے انکل نے کہا۔ یہ ادھیڑ عمر کے ایک توانا اور صحت مند آدمی تھے

"ابھی اور اسی وقت آپ میرے ساتھ چلیں گے۔" کرنل بولے۔

"م ـــــ مگر۔ میں تو ساڑھے بارہ بجے والی گاڑی سے واپس جا رہا ہوں۔"

"کچھ بھی ہو مگر ایک روز میرے ساتھ ضرور قیام کریئے۔" کرنل صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر لفٹ کی طرف لے جاتے ہوئے بولے لفٹ میں بھی ان کے انکل انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ اسی ٹرین سے ان کی واپسی بے حد ضروری ہے۔ لنکن

میں بیٹھتے ہوئے کرنل نے گلوگیر آواز میں کہا "قریبی عزیزوں میں آپ کے علاوہ اب اور کون ہے جسے اپنا کہہ سکوں اور آپ ہیں کہ سامنا ہو جانے پر بھی دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے بھئی .... خیر" انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ گویا انہوں نے کرنل کی ضد کے سامنے ہار مان لی تھی۔

"بس اب یہاں سے گھر چلیے ۔ فی الحال میں اپنا وہ کام بھی ملتوی کرتا ہوں جس کے لئے یہاں آیا تھا۔"

"کس کام سے ؟"

"آپ میرے پیشے سے واقف ہی ہیں۔"

"اوہو ۔ کوئی خاص بات ۔"

"ہاں ـــــ اُں ـــــ ہوتا ہی رہتا ہے ۔ پھر نہ پوچھو۔"

تھوڑی دیر بعد لنکن کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہی تھی مجھے حیرت تھی کہ آخر کرنل صاحب جیسے با اصول آدمی نے ایک اہم معاملے کو کھٹائی میں ڈال کر اقربا نوازی کا چکر کیوں چلا دیا لیکن میں کچھ نہ بولا۔ رفیعہ شہزاد یہاں اجنبی تھی ۔ صبح اس کی لاش ملے گی کیونکہ یہاں اجنبی تھی لہذا شناخت نہ ہو سکنے کی بنا پر لاش کے فوٹو بھی اخبارات میں شائع کیے جا سکتے ہیں اور یہ چیز کم از کم میرے حق میں بہت مضر ثابت ہوتی ۔ اگر وہ دوسروں سے بھی میرے متعلق گفتگو نہ کرتی رہی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی ۔ میں سوچتا رہا اور بور ہوتا رہا ۔ کرنل نے پھر اس کے بارے میں کوئی گفتگو ہی نہ کی ۔ اپنے "انکل" سمیت مہمان خانے میں چلے گئے تھے۔

میری آنکھوں سے نیند اُڑ چکی تھی ۔ خواب گاہ میں ٹہلتا رہا ۔ دو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی ۔ میں نے ریسیور اُٹھایا ۔ دوسری طرف سے کرنل بول رہے تھے ۔ فرمانے لگے "انکل کو نیند نہیں آ رہی۔"

سخت تاؤ آیا، گویا میں یہی معلوم کرنے کے لیے بے خوابی کا شکار ہو رہا تھا۔ "خدا انہیں دائمی سکون عطا کرے۔" میں نے جل کر کہا۔

"وہ تصویر میری خواب گاہ میں ، سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی ہے ۔ اُسے لے کر کیفے وکٹوریہ چلے جاؤ ... اس کا منیجر تمہارا منتظر ہے ۔ وقت کم ہے جلدی کرو ، میں اسے پہلے ہی فون کر چکا ہوں ۔" پھر مزید کچھ کہے بغیر انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو آپ جانتے ہی ہیں ۔ میں کیا کرتا لیکن اس وقت تو وہی کرتا تھا جو کچھ کہا جاتا۔

کیفے وکٹوریہ کا منیجر مجھے ان لوگوں سے ملاتا پھرا جو اس قسم کی تصاویر کا بیوپار کرتے ہیں ۔ میں انہیں اپنے پاس والی تصویر کے چہرے چھپا کر صرف پوز دکھاتا اور ان سے معلومات حاصل کرتا ۔ دو گھنٹے کی دوا دوش کے بعد ایک بیوپاری ایسا ملا جس نے بتایا کہ پندرہ دن قبل اسی پوز کی ایک صد کاپیاں اس کے پاس تھیں لیکن ایک آدمی ساری خرید کر لے گیا تھا اور یہی نہیں اسی پوز کی مزید تصاویر کے لیے اس نے اس کا پورا اسٹاک کھنگال ڈالا تھا ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس آدمی کو شناخت کر سکے گا ۔ میری دانست میں یہ کام کی بات تھی ۔ اس سے پہلے جن آدمیوں سے ملا تھا ۔ ان کے پاس اس پوز والی تصاویر سرے سے تھیں ہی نہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ مجرم بھی مختلف جگہوں پر تلاش کرتا ہوا اس بیوپاری تک پہنچا ہو ۔

واپسی پر ساڑھے چار بج چکے تھے ۔ کرنل صاحب ڈرائینگ روم میں موجود تھے اور ان کے انکل کسی مسئلے پر دل کھول کر بولے جا رہے تھے ۔ کرنل کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی برخوردار اپنے کسی بزرگ کے پند و نصائح کان دھر کر ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا ہو ـــ میز پر کافی کا ساز و سامان چُنا ہوا تھا ۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئے اور کرنل نے پلٹ کر پوچھا "کیا رہا ؟"

میں نے پوری رُوداد سُنائی اور کرنل پُر تفکر انداز میں سر ہلاتے رہے ۔ "کافی پیو ! اور ہمارے لیے بھی بناؤ ۔" کرنل نے اس مسئلے پر اظہارِ خیال کی بجائے کہا ۔

"ہم ـــــ میں اب نہیں پیوں گا ۔ میری طبیعت کچھ بگڑ رہی ہے ۔" انکل بولے ۔

"اوہ ... خیر ! حمید میرے لیے انڈیلو ۔"

"میں پچھلے چھ ماہ سے بے خوابی اور اختلاجِ قلب کا مریض ہوں ۔" انکل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔

"تو کیا اس وقت اختلاجی کیفیت محسوس کر رہے ہیں آپ ؟" کرنل نے پوچھا ۔

"ہاں ۔"

"اوہ ..... تب تو آپ کو صرف تفریح کرنی چاہیے ۔" انکل صرف کرنل کو دیکھتے رہے ۔ کچھ بولے نہیں ۔ ہم دونوں نے کافی کا ایک ایک کپ پیا اور کرنل اُٹھ کھڑے ہوئے ۔

"چلیے ... آپ کو اختلاج ہو رہا ہے تو کہیں چلتے ہیں ۔" انہوں نے کہا ۔

"نہیں بھئی .... اب اس وقت ... ارے لو پانچ بج گئے ہیں ۔"

"چلیے بھی اس وقت کی ہوا اختلاجِ قلب کے مریضوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوتی ہے ۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کرنل کو ہو کیا گیا ہے ۔ انہوں نے بالآخر اپنے انکل کو ہوا خوری پر مجبور کر ہی دیا اور ہم لنکن پر آ بیٹھے ۔ کرنل خود ہی ڈرائیو کر رہے تھے اور انکل کو انہوں نے اپنے پاس ہی بٹھایا تھا ۔ پتہ نہیں کس زمانے کی باتیں چھیڑ کر ان کا دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ بیک وقت کتنے کام کر سکتا ہے یہ شخص ۔ کیس کی تفتیش ہو رہی ہے اور ایک رشتہ دار کو انٹرٹین بھی کیا جا رہا ہے ۔ تھوڑی ہی دیر میں اختلاج زدہ انکل قہقہے لگانے کے قابل ہو گئے تھے ۔ بہر حال مجھے ان باتوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی میں تو سوچ رہا تھا اب دو تین گھنٹوں کے بعد رفیعہ شہزاد کی لاش برآمد کر لی جائے گی اور میں دشواریوں میں پڑ جاؤں گا ۔ میں اس بُری طرح ان خیالات میں اُلجھا ہوا تھا کہ گرد و پیش کا احساس ہی نہ رہا ۔ اسی وقت خیال کے تانے بانے ٹوٹے تھے جب کار رُکی تھی ۔ کرنل گاڑی سے اُترتے ہوئے انکل سے بولے "اُتریے ۔"

"گگ ـــــ کیوں ـــــ کہاں ؟"

"گرینڈ ہوٹل ہے ۔ ذرا ایک صاحبہ سے ملتا چلوں ۔ وہ بیمار تھیں !"

"صص ـــــ صاحبہ"

"جی ہاں ـــــ ایک ملنے والی ہیں کمرہ نمبر تیرہ میں ۔" گرینڈ اور کمرہ نمبر تیرہ کے حوالے پر میں سنبھل کر بیٹھ گیا ۔ انکل بولے ۔ "تم ہو آؤ ۔ میں یہیں بیٹھا ہوں ۔"

"اختلاجی کیفیت میں آپ کو تنہا کیسے چھوڑا جا سکتا ہے ۔" کرنل کے لہجے میں حیرت تھی ۔

"کیا تم میرا مذاق اُڑانے کی کوشش کر رہے ہو ۔" دفعتہً انکل کا لہجہ بدل گیا ۔

"میں آپ کو کمرہ نمبر تیرہ میں ضرور لے جاؤں گا ۔"

"کیا بیہودگی ہے ؟"

"میں تو ضرور لے جاؤں گا ۔"

"تم بکواس کرتے ہو ۔"

"آپ چچا ہیں میرے ۔ سخت سُست کہنے کا حق حاصل ہے آپ کو لیکن اس کے باوجود آپ کو چلنا پڑے گا ۔"

"خاموش رہو ۔"

دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ ہماری گاڑی کے قریب تین چار آدمی اور بھی موجود ہیں ۔ "انہیں کمرہ نمبر تیرہ میں لے چلو !" کرنل نے ان سے کہا ۔

"اوکے سر" ان میں سے ایک آدمی بولا اور انکل کا ہاتھ پکڑ کر نیچے کھینچ لیا ۔

"نہیں ـــــ نہیں ـــــ" اب انکل کی آواز میں خوفزدگی کے آثار تھے ۔

"لے چلو ۔" کرنل غرائے ۔ ان کے لہجے کی تبدیلی حیرت انگیز تھی ۔ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا ، انکل گھسیٹے جا رہے تھے اور بھتیجے صاحب اس واردات پر اتنے مطمئن اور آسودہ نظر آ رہے تھے جیسے بزرگوں کی خدمت کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کر بیٹھنے کا شرف حاصل ہو گیا ہو ۔ "میں نہیں جاؤں گا ۔ میں نہیں جاؤں گا ۔" دفعتہً انہوں نے ہذیانی انداز میں چیخنا شروع کر دیا ۔

"ہتھکڑیاں لگا دو ـــــ" کرنل پھر غرائے اور بلند آواز میں بولے "طارق سعید میں تمہیں ایک نامعلوم عورت کو قتل کر دینے کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں ۔"

"مجھے چھوڑ دو ، مجھے چھوڑ دو ..." انکل چیختے جا رہے تھے اور مجھ پر کسی حد تک بوکھلاہٹ کا دورہ پڑ چکا تھا ۔

اس طرح لاش دریافت ہونے سے قبل ہی ملزم ہاتھ آ گیا تھا اور میں نے اطمینان کی سانس لی تھی لیکن ذہن بدستور اُلجھا ہوا تھا ۔ آخر یہ سب ہوا کیسے ؟ شام تک کرنل سے ملاقات نہ ہو سکی ! بہر حال انہوں نے پہلی اطلاع یہی دی تھی کہ مجرم نے اعترافِ جرم کر لیا ہے ۔

"یہ احمق ۔" کرنل سگار سُلگاتے ہوئے بولے ! "جب بھی کسی جرم کی اسکیم بناتے ہیں تو زیادہ تر خواب دیکھتے رہتے ہیں جس کے خلاف جرم کرتے ہیں اس کی نفسیات کا قیاس بھی خود پر ہی کرتے ہیں اور پھر پتہ نہیں کیوں انہیں اپنے شریکِ جرم پر بھی اتنا ہی اعتماد ہوتا ہے جتنا خود پر ممکن ہے ۔"

"شریکِ جرم ؟ ۔ میں نہیں سمجھا ۔" میں بولا ۔

"مقتولہ کو مظلوم نہ سمجھو ! وہ اس جرم میں برابر کی شریک تھی ۔ وہ صرف اس لیے مار ڈالی گئی کہ اس نے بوکھلاہٹ میں

طارق سعید کا صحیح نام تمہیں بتا دیا تھا!... جب تم اسے گرینڈ میں چھوڑ کر واپس گئے تو وہ وہاں پہنچا تھا اور سلطانہ نے اس سے تذکرہ کیا تھا کہ وہ غلطی سے اس کا نام لے بیٹھی ہے۔ بس چچا سعید نے فوری اشتعال کے تحت اس کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ ان کی داشتہ تھی۔"

"لیکن چکر کیا تھا؟"

"بس اتنی سی بات تھی کہ چچا سعید مجھے قتل کر دینا چاہتے تھے۔"

"آخر کیوں؟ آپ کو قتل کرانا چاہتے تھے، حیرت ہے۔"

"سنتے جاؤ۔ شاید تمہارے حواس بھی درست نہیں... انکل سعید وہ قریب ترین عزیز ہیں، جنہیں میرا ترکہ مل سکتا ہے۔"

میرا سر چکرا گیا لیکن سوال یہ ہے کہ اس تصویر اور اس اسکینڈل کی کیا ضرورت تھی اور پھر وہ تو صرف مجھے بدنام کرنی پھر رہی تھی، بھلا اس سے کرنل کا کیا تعلق؟ اس سوال کا جواب بہت زیادہ حیرت انگیز تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کرنل نے مجھے اس وقت قتل کیوں نہ کر دیا تھا، جب میں نے وہ تصویر انہیں دکھائی تھی۔ ہو سکتا ہے میرا یہی حشر ہوتا۔ اگر وہ کسی اقدام سے قبل پوری طرح اطمینان نہ کر لینا چاہتے۔ میں نے ان کے سامنے ایک البم پڑا ہوا دیکھا تھا اور میری دی ہوئی تصویر اُن کے سامنے تھی۔ البم کی جس تصویر سے وہ اس تصویر کو ملانا چاہتے تھے۔ اگر البم میں نہ ملی ہوتی تو میرا پتہ نہیں کیا حشر ہوتا۔ وہ ان کے والد صاحب کی جوانی کی ایک تصویر تھی...! میں نے سُنا اور سناٹے میں آگیا۔

"ظاہر ہے!" کرنل بولے! "جب وہ تصویر مجھ تک پہنچی تو میں آپے سے باہر ہو کر اس عورت کی تلاش شروع کر دیتا اپنے آبائی علاقے میں جاتا اور پتہ لگانے کی کوشش شروع کر دیتا کہ وہ تصویر اسے کس سے ملی ہوگی اور وہیں موقع دیکھ کر انکل سعید مجھے ٹھکانے لگا دیتے۔"

"لیکن مجھ تک تصویر پہنچانے کے بعد بھی وہ لوگ یہاں کیوں ٹھہرے رہے...؟" میں نے پوچھا۔

"یادداشت پر زور دو، پہلی بار تم اس سے میک اپ میں ملے تھے... اور تم نے خود کو کیپٹن حمید ظاہر کیا تھا۔ انکل سعید اس وقت بھی وہیں موجود تھے۔ وہ تمہیں پہچانتے تھے، میرے سارے ہی عزیز تمہیں پہچانتے ہیں۔ خواہ تم انہیں نہ جانتے ہو۔ کم از کم سبھوں نے تمہاری تصویریں تو دیکھی ہی ہیں۔ بہر حال انکل سعید تمہارے میک اپ میں ہونے کی وجہ سے تمہیں نہ پہچان سکے اور سلطانہ کو بتایا کہ تصویر غلط ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے ساتھ ہی انہوں نے اس کے قیام کا انتظام گرینڈ میں کر دیا اور اسے ہدایت دی کہ تمہیں بدنام کرنے کا سلسلہ جاری رکھے اور وہ خود یہ دیکھیں گے کہ تصویر کون لے گیا ہے! دوسرے دن تم اسے اپنی اصلی شکل میں ملے اور وہ نروس ہو گئی اور ہوٹل ڈی فرانس سے اپنی منتقلی کے بارے میں ایک کہانی فوری طور پر گھڑ ڈالنے کی کوشش تو کی لیکن نروس ہو جانے کی وجہ سے اس میں کامیاب نہ ہو سکی اور بے خیالی میں سعید کا نام زبان سے پھسل گیا۔ بہر حال ہم نے انکل سعید کو اس وقت جا لیا تھا، جب وہ اس کے قتل کے بعد ہوٹل ڈی فرانس سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے، تصویروں کے اس بیوپاری نے بھی انہیں شناخت کر لیا ہے جس سے انہوں نے اسی پوز کا پورا اسٹاک حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔" کرنل خاموش ہو کر سگار کے کش لینے لگے۔

"اب طارق سعید کے بارے میں مزید کچھ بتایئے؟" میں نے کہا۔

"کیا بتاؤں؟" کرنل نے طویل سانس لی۔ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے "بے اعتدالی آدمی کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ ان کی بھی خاصی بڑی جائداد تھی لیکن عیاشیوں کی نذر ہو گئی اتفاق سے ان کے بھی آگے پیچھے کوئی نہیں ہے... کسی دن شراب کے نشے میں بیٹھ کر دولت حاصل کرنے کی اس جدوجہد کی اسکیم بنا ڈالی ہوگی۔ بھئی میری موت کے بعد اسی طرح یہ سب کچھ ان کے ہاتھ میں آتا جیسے الہ دین کا چراغ شاملِ حال ہو۔"

کھیل ختم ہو چکا تھا، مجھے وہ عورت یاد آئی۔ اسکی غمگین آنکھیں یاد آئیں۔ اُنکی بناوٹ نے عجیب سا سوز و گداز اس کی شخصیت کو عطا کیا تھا۔ کون باور کرتا کہ وہ قتل کی سازش میں ملوث ہوگی۔

ٹیمز فانڈ

ابنِ صفی

پیروڈی لکھنے میں بھی
محترم ابنِ صفی کا انداز سب سے جداگانہ رہا ہے
مشہور کردار جیمز بانڈ کے ہم وزن
ٹیمز فانڈ کا ایک کارنامہ

سیکرٹ سروس کے سربراہ کا نام کچھ بھی رہا ہو لیکن وہ محکمے میں "ڈبلیو" کہلاتا تھا۔ انگریزی کا حرفِ تہجی "W"۔ یہ دُنیا کے تینوں زمانوں کی نظروں سے اپنے ماتحتوں کو دیکھ سکتا تھا "پتھریلی نظر" پتھر کے زمانے سے تعلق رکھتی تھی۔ دھات کی نظر دھات کے زمانے سے تعلق رکھتی تھی اور ایٹمی نظر ظاہر ہے کہ ایٹمی دور سے تعلق رکھتی ہوگی۔

وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا تھا جس میں صرف ایک دروازہ تھا۔ نہ کوئی روشندان تھا اور نہ کھڑکی تھی۔ دروازہ بھی عموماً بند ہی رہتا تھا۔ غالباً اُسے تازہ ہوا کی ضرورت نہیں تھی۔

اُس کی میز پر صرف تین عدد فون رکھے تھے۔ اُس نے نیلے رنگ کے انسٹرومنٹ کا ریسیور اُٹھا کر ایک بٹن دبایا اور ماؤتھ پیس

پر بھر پلی نظر ڈال کر غرّایا۔ "زیرو زیرو زیرو سکس۔ زیرو زیرو سکس زیرو سکس کو بھیج دو۔"

اس کے بعد اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر خلا میں اپنی نظروں سے گھورنا شروع کر دیا تھا۔

قبل اس کے کہ ایٹمی نظر کا دور شروع ہوتا، دروازہ کھلا اور زیرو، زیرو، زیرو سکس، زیرو زیرو سکس، زیرو سکس کمرے میں داخل ہوا۔ یہ "ڈبلیو" کا ایک ماتحت تھا اور مصنف کی آسانی کے لیے ٹیمز فانڈ بھی کہلاتا تھا۔

ٹیمز فانڈ نہ کہلاتا تو مصنف بڑی دشواری میں پڑ جاتا۔ اُسے تو ذرا اچھا نہ لگتا یہ لکھتے ہوئے کہ "زیرو زیرو زیرو سکس زیرو زیرو سکس زیرو سکس نے آگے بڑھ کر اُس لڑکی کا بوسہ لے لیا جو دیر سے اُس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔"

اس طرح فن کا خون بھی ہوتا اور جمالیات کا بھی۔۔۔ وہ ڈبلیو کی میز کے سامنے رک گیا۔ کمرے میں کوئی دوسری کرسی نہیں تھی اس لیے ماتحتوں کو کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ ڈبلیو نے اس پر پتھریلی نظر ڈالی اور اُسے جماہیاں آنے لگیں۔ پھر آہنی نظر ڈالی تو ایک لڑکی کی نیلی آنکھیں یاد آئیں اور ایٹمی نظر پڑتے ہی ٹیمز فانڈ کو خیال آیا کہ اُس نے کئی دنوں سے جوا نہیں کھیلا۔ ڈبلیو جیسے ان بدلتی ہوئی ذہنی کیفیات سے آگاہ ہو، اُس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "عورت، شراب اور جوا۔ تینوں کے لیے مواقع موجود ہیں۔"

"یس سر!" ٹیمز فانڈ کے لہجے میں سعادت مندی تھی!

"لیکن کام آسان نہیں۔!"

ٹیمز فانڈ استفہامیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ دفعتاً ڈبلیو نے بائیں جانب ہاتھ اُٹھا کر ایک گوشے کی طرف اشارا کیا۔ ٹیمز فانڈ بھی اُدھر ہی دیکھنے لگا لیکن بات پلّے نہ پڑی۔

ڈبلیو میز پر ہاتھ مار کر دھاڑا۔ "اُس گوشے میں دیوار کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

ٹیمز فانڈ "سرپٹ" کی رفتار سے وہاں پہنچا تھا اور اُس کی خواہش کے مطابق پوزیشن اختیار کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔

"پانچ منٹ تک یُونہی کھڑے رہو، یہ تمھاری سزا ہے۔"

پانچ منٹ گزارنے کے بعد ٹیمز فانڈ نے اپنا قصور معلوم کرنا چاہا۔ "قصور ۔۔ ہُوں" ڈبلیو اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہُوا غرّایا۔ "میں نے سُنا ہے کہ تم اس طرح بوسہ لیتے ہو جیسے نیگرو سیٹی بجاتے ہیں۔"

"بہت پُرانی بات ہے جنابِ عالی! آپ کو یاد ہو گا کہ ایک بار رُوسیوں نے مجھے پکڑ کر میری برین واشنگ کر دی تھی۔۔۔ اپنی ساری عادتیں بھول گیا تھا۔ ایک بوسے ہی پر کیا منحصر ہے۔ مجھے تو یہاں تک اطلاع ملی ہے کہ میں نے ایک بار ایک بھینس کا بھی بوسہ لینے کی کوشش کی تھی اور ٹریفک کانسٹیبل نے مجھے بڑے ادب سے گھر پہنچا دیا تھا۔"

"اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔!" ڈبلیو نے مایوسی سے کہا۔ "ہو سکتا ہے اُسی زمانے کی بات ہو۔ خیر۔۔ تمھیں آج ہی پہلے جہاز سے مونٹی کارلو پہنچنا ہے۔۔۔"

"او کے باس۔۔۔" ٹیمز فانڈ کھِل اُٹھا۔

"پچاس ملین فرانک وہاں تمھارے نام ٹرانسفر کر دیے گئے ہیں۔ جیتو یا ہارو۔ محکمے کو اس سے کوئی سروکار نہ ہو گا۔۔۔!"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے جنابِ عالی۔۔۔"

"شراب اپنے پاس سے پیو گے۔۔۔؟"

"میں تو بالکل کنگال ہو رہا ہوں جنابِ عالی۔"

"خیر، کچھ رقم اُس کے لیے بھی مل جائے گی۔۔۔ بس اب باقی ہدایات وہیں ملیں گی۔ موسیو پمپاس۔ نام یاد رکھنا۔"

مزید آسانی کے لیے اُسے موسیو پمپاس کی تصویر بھی دی گئی۔ جب وہ دفاتر کی حدود سے باہر نکل رہا تھا اُس کی ملاقات مسٹر ایکس کے محکمے کے سیکرٹری سے ہوئی جس نے ٹیمز فانڈ کا شہرہ آفاق بریف کیس اُس کے حوالے کیا۔ اس بریف کیس میں ایک دُنیا آباد تھی۔ مسٹر ایکس کے محکمے کے سیکرٹری نے کچھ کاغذات بھی اُس کے حوالے کیے جن میں اُس کا پاسپورٹ، ہوٹل کا ریزرویشن کارڈ اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی شامل تھے۔ مونٹی کارلو پہنچ کر اُسے ہوٹل دے مُتّو کے کمرہ نمبر سات میں قیام کرنا تھا۔ لہٰذا مونٹی کارلو پہنچ کر وہ سیدھا "ہوٹل دے مُتّو" جا پہنچا۔ سفر خوشگوار گزرا تھا۔ راستے بھر ایک ائر ہوسٹس کو گھورتا آیا تھا لیکن مجبور تھا۔ اپنا اصل نام اسے نہ بتا سکا ورنہ وہ اس میں خصوصی دلچسپی لیے بغیر نہ رہتی کیونکہ ٹیمز فانڈ ایک بین الاقوامی ہیرو تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اچانک اُسے ایک بات یاد آئی اور اُس نے فون پر لانگ ڈسٹنس مانگ کر اپنے باس ڈبلیو کے نمبر ڈائل کیے۔

اُسے ہر وقت فون کیا جا سکتا تھا کیونکہ اسے کبھی کسی نے کسی وقت بھی سوتے نہیں دیکھا تھا۔

دوسری طرف سے ڈبلیو کی آواز سُن کر ٹیمز فانڈ نے کہا۔ "میں بعافیت مونٹی کارلو پہنچ گیا ہوں۔ جنابِ عالی لیکن آپ کے احکامات میں لڑکی کا کہیں کوئی ذکر نہیں تھا۔"

"اِس بار صرف شراب اور جوئے سے دِل بہلاؤ۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔ "برین واشنگ کے اثرات اب بھی تم میں پائے جاتے ہیں اس لیے احتیاط لازمی ہے۔"

"بہت بہتر ہے جنابِ عالی۔۔۔" ٹیمز فانڈ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

ٹھیک اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی اور ٹیمز فانڈ اچھل پڑا۔ بغلی ہولسٹر سے آٹومیٹک پستول نکال کر بڑی احتیاط سے دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازہ اس نے ایسے انداز میں کھولا تھا کہ خود تو اوٹ میں رہے اور آنے والا اُس کے پستول کی زد پر ہو۔

خیریت گزری کہ اس وقت وہ نشے میں نہیں تھا، ورنہ موسیو پمپاس کی کھوپڑی میں خواہ مخواہ سوراخ ہو جاتا۔

اُس نے اُسے فوراً ہی پہچان لیا۔۔۔ موسیو پمپاس دُبلا پتلا اور چھوٹے سے قد کا آدمی تھا۔ چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی تھی اور آنکھوں پر ریم لیس فریم کی عینک جو چہرے پر ٹیڑھی لگی تھی جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ موسیو پمپاس کا ایک کان دوسرے کی مناسبت سے کسی قدر اُونچائی پر واقع تھا۔

"کیا یہ کمرہ نمبر سات نہیں ہے؟" موسیو پمپاس کی منمناتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی۔

"بالکل ہے۔" ٹیمز فانڈ پستول چھپاتا ہُوا مسکرایا۔

"تو پھر تم کون ہو؟"

"آرام سے بیٹھ جایئے موسیو پمپاس۔"

"کیا۔" پمپاس اچھل پڑا۔ "تم میرا نام کیا جانو!"

"آپ کو بھی میرا نام معلوم ہو گا موسیو پمپاس۔"

"قطعی نہیں۔۔۔ میں کیا جانوں۔"

"تو پھر کمرہ نمبر سات میں آپ کا کیا کام۔۔۔؟"

"مجھے ہدایت مِلی تھی کہ کمرہ نمبر سات میں مجھے مس ٹیمز فانڈ نامی خاتون سے ملنا چاہیے۔"

"اس کے لیے تمھیں کم از کم بیس سال انتظار کرنا پڑے گا۔ موسیو پمپاس!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پہلے کسی مسز ٹیمز فانڈ کا انتظام کرنا پڑے گا اور پھر یہ ضروری نہ ہو گا کہ ان کی پہلی اولاد لڑکی ہی ہو اور ظاہر ہے کہ اس کے جوان ہونے میں کم از کم بیس سال ضرور لگیں گے۔"

"اگر تم فرانسیسی میں اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کر سکتے تو انگریزی میں بات کرو۔" موسیو پمپاس نے بُرا مان کر کہا۔

"میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔" ٹیمز فانڈ نے اُس کے چہرے کے قریب اُنگلی نچا کر اُسے چھیڑا۔

پمپاس نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "یقیناً، کوئی غلطی ہُوئی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔"

"ٹھہرو۔" ٹیمز فانڈ نے اُس کا شانہ پکڑ کر اِس طرح دبایا کہ وہ کراہتا ہُوا دُہرا ہو گیا۔

پھر دھکا دے کر اُسے کُرسی پر گرا دیا۔ موسیو پمپاس ہانپ رہا تھا اور اُس کی آنکھیں کسی زہریلے سانپ کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"یقیناً کوئی غلطی ہُوئی ہے۔" ٹیمز فانڈ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہُوا غرّایا۔

"تو پھر۔!"

"کمرہ نمبر سات میں تمھیں کِس نے بھیجا تھا؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے ایک تصویر دی گئی تھی جس کی پشت پر لکھا ہُوا ہے مس ٹیمز فانڈ اور کہا گیا تھا کہ مجھے "ہوٹل دے مُتّو" کے کمرے نمبر سات میں جانا ہے۔"

"لاؤ نکالو۔ وہ تصویر۔"

پمپاس نے کانپتے ہُوئے ہاتھ سے تصویر نکال کر اس کے حوالے کی۔ دَراصل وہ اس کے ہاتھ میں دبے ہُوئے پستول کی جھلک پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

اور تصویر دیکھ کر ٹیمز فانڈ کی آنکھیں کھل گئیں۔ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس نے آہستہ سے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور تصویر کی پشت والی تحریر پر نظر جما دی۔

اس کے بعد اُس پر ہنسی کا دَورہ پڑ گیا تھا۔ موسیو پمپاس اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔

★★

کمرے سے نکل کر راہداری میں آیا، موسیو پمپاس کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔

بار میں بھی وہ کہیں نہ دکھائی دیا۔

اُس نے بار ٹینڈر سے کہا۔ "میرا اپنا ذاتی ٹیسٹ ہے۔ تم ڈرائی جن۔ بوربن۔ واڈکا اور شیری مکس کر کے اُس میں آدھے کیلے کا چھلکا، ناشپاتی کا چھلکا اور اخروٹ کا چھلکا شامل کرو۔ اور شیکر میں ڈال کر اتنا ہلاؤ کہ سب یک جان ہو جائیں۔۔۔ ذرا جلدی۔۔۔ شکریہ۔"

بار ٹینڈر جو اس دوران میں اُسے حیرت سے دیکھتا رہا تھا۔

ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ہمارے پاس کوئی ایسا مکسر یا شیکر نہیں ہے، جناب! جو ان تینوں چھلکوں کو شراب میں حل کر سکے...؟"

"اچھا تو پہلے چھلکے لاؤ... شراب بعد میں دینا..."

بار مین نے تینوں قسم کے چھلکے پلیٹ میں رکھ کر پیش کیے ٹیمز فانڈ نے پہلے اخروٹ کے چھلکے چبائے پھر کیلے کے۔ اس کے بعد ناشپاتی کے چھلکے حلق سے اتار ہی رہا تھا کہ بار ٹنڈر نے گلاس بھی اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ اپنے نسخے کو پیٹنٹ کیوں نہیں کرا لیتے مسٹر؟"

"تم نے بہت اچھا سوال کیا، میں تمھیں بھاری ٹپ دوں گا۔"

پھر تین گھونٹوں میں اس نے گلاس خالی کر دیا تھا۔ دماغ گرم ہوتے ہی موسیو پپاس والی تصویر کا خیال آیا اور اس نے اُسے جیب سے نکال کر بار ٹنڈر کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "اسے پہچانتے ہو؟"

"جی نہیں۔" بار ٹنڈر نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

ٹیمز فانڈ جو ماہر نفسیات بھی تھا فوراً سمجھ گیا کہ بار ٹنڈر کیا چاہتا ہے۔ اس نے جیب سے اپنی نوٹ بک نکالی اور اس سے ایک کرنسی نوٹ کھینچ کر تصویر پر رکھتا ہوا بولا۔ "اب بتاؤ؟"

بار ٹنڈر نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ سمیت تصویر کاؤنٹر سے اٹھائی اور اسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔ "اوہ۔ کیوں نہیں۔ یہ تو مادموزیل ویراں ہیں۔ اس وقت بھی آپ کو "کاسینو موجو" میں مل جائیں گی۔ بکارت کی میز پر۔"

اور تب ٹیمز فانڈ کو احساس ہوا اس کا چیف ڈبلیو کتنا چالاک آدمی ہے۔ شراب اور جوئے کے ساتھ ہی لڑکی کا انتظام اتنے پراسرار طور پر کر دیا... وہ کتنا باخبر آدمی ہے۔ یہ تک جانتا ہے کہ ٹیمز فانڈ مونٹی کارلو میں صرف کاسینو موجو ہی میں کھیلتا ہے۔

لیکن یہ مادموزیل ویراں۔ آخر مقصد کیا ہے؟ پچاس ملین فرانک کیا صرف ضائع کرنے کے لیے ہی ہیں؟

شراب کی قیمت ادا کرنے کے بعد وہ پھر اپنے کمرے کی طرف بھاگا اور فون پر ڈبلیو سے رابطہ قائم کر کے رپورٹ دی۔

"ٹھیک۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "تمھیں ویراں کو کنگال کر دینا ہے۔ اس وقت اس کے پاس بھی پچاس ملین فرانک ہیں۔ اگر وہ اس کے پاس سے نکل جائیں تو وہ خودکشی کر لے گی۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ وہ خودکشی کرلے؟" ٹیمز فانڈ نے ناخوشگوار لہجے میں پوچھا۔

"بے حد ضروری۔"

"کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"ہوش میں آؤ۔ تمھیں کوئی سوال کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ شاید تمھاری ذہنی رو پھر بہک رہی ہے؟"

"آئی۔ ایم سوری سر!"

"بس۔" دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز... اس نے ٹھنڈی سانس لے کر ریسیور رکھ دیا۔

کاسینو موجو پہنچنے میں اس نے دیر نہیں لگائی تھی۔ کا... منتظمین کے لیے اس کی شخصیت جانی پہچانی تھی۔ وہ اسے انگ... کے ایک پشتینی رئیس کی حیثیت سے جانتے تھے۔

بکارت کی میز پر وہ ہمیشہ چھ نمبر کی کرسی پر بیٹھتا تھا۔ اتفا... سے وہ آج بھی خالی تھی۔ عین اسی کرسی کے سامنے والی کرسی پر... لڑکی نظر آئی جس کا نام ویراں تھا۔

پانچ نمبر کی کرسی پر ایک بوڑھا اطالوی تھا جس سے اس... کا کھیل ہو رہا تھا۔

ٹیمز فانڈ تھوڑی دیر تک ان کے کھیل کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر... دوسرے دن کے کھیل کے لیے چھ نمبر کی کرسی ریزرو کرائی اور کا... سے اٹھ آیا۔ لڑکی بہت مغرور معلوم ہوتی تھی کیونکہ اس نے ٹیمز فا... جیسے گلفام کو صرف ایک ہی بار دیکھ کر اپنے ذہن سے جھٹک... دوسری بار سہواً بھی اس کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ ٹیمز فانڈ... ہوتا ہوا اپنے ہوٹل میں واپس آگیا۔ پھر اس نے ایسا انتظام کیا... پورے پچاس ملین فرانک بینک سے نکلوا کر کاسینو کے کیشیر کے... جمع کرا دیے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کل اس مغرور لڑکی کو اپنے قد... پر جھکائے بغیر نہیں چھوڑے گا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی لڑکی اسے دیکھ کر نہیں مسکرائی تھی... اسی جھنجلاہٹ میں ایک بار پھر اس نے اپنے چیف ڈبلیو... سے فون پر رابطہ قائم کیا اور دوسری طرف سے اس کی غراہٹ... سنائی دی۔

"تم کیوں میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"صرف ایک بات جناب عالی؟" ٹیمز فانڈ نے دانت پیس...

"بکو۔ کیا بکتے ہو؟"

"میں اس لڑکی پر ذرہ برابر بھی رحم نہ کروں گا۔"

"کیا میں نے تمھیں اس پر رحم کرنے کے لیے بھیجا ہے؟"

"میں نے کہا بتا دوں آپ کو۔"

"اوہ تم باز نہیں آؤ گے۔ اس طرح مجھے بور کر کے اس کی... کا اندازہ لگانا چاہتے ہو۔ اچھا سنو... اس کا سرمایہ ہمارے ملکی... کے خلاف استعمال ہو رہا ہے۔ اگر وہ مفلس ہو جائے تو ہم کئی دشمن...

...ہو جائیں گے۔"

نہ جانے کیوں ٹیمز فانڈ نے ایسا بُرا منہ بنایا جیسے کونین پاؤڈر... زبان پر رکھتے ہی پھٹ گیا ہو۔

مزید کچھ کہے بغیر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

رات بھر انگاروں کے بستر پر لوٹتا رہا۔ لڑکی مغرور سہی لیکن... اس کی اصل حیثیت معلوم کر کے ٹیمز فانڈ کو بے حد افسوس ہوا تھا۔ ...ہوتی تو کسی نہ کسی طرح راہِ راست پر آجاتی لیکن یہ کہ وہ کسی دشمن... ثابت ہو اور... اور... پھر۔

رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ لہٰذا دن بھر سوتا رہا... چار... شام کو اٹھ کر سوچنے لگا کہ پہلے ناشتہ کرے یا لنچ کرے۔ دونوں... تھے اور پھر شام کی چائے... آخر اس نے فیصلہ کیا کہ ناشتہ... اور شام کی چائے تینوں بیک وقت طلب کر لے انھیں ختم... کرتے رات کے کھانے کا وقت ہو ہی جائے گا۔ اس طرح دن بھر کے... فرائض کی ادائیگی کے بعد... وہ پورے اطمینان کے ساتھ جوا... کھیل سکے گا۔

ٹھیک نو بجے شب وہ ناشتہ، لنچ، شام کی چائے اور رات... کھانے سے فارغ ہو کر اس سوچ میں پڑ گیا کہ کھانے سے قبل والی... نوشی تو رہ ہی گئی۔

اب کیا ہو گا؟ کیا وہ دلجمعی کے ساتھ جوا کھیل سکے گا۔ معمولات... ذرہ برابر فرق بھی اسے ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیتا تھا۔

ٹھیک دس بجے وہ کاسینو پہنچا۔ لڑکی بکارت کی میز پر... تھی اور اس کے سامنے فرانک نوٹوں کی گڈیوں کا ایک بہت... ڈھیر موجود تھا۔ ٹیمز فانڈ نے اسے مرعوب کرنے کے لیے پورے پچاس... فرانک کاسینو کے بینک سے نکلوا لیے لیکن اس کے باوجود بھی... نامعقول لڑکی نے اس کی طرف خصوصی توجہ نہ دی۔ اس وقت... اکیلی ہی بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ کھیلنے والا آخری آدمی بھی ٹھنڈی... لے کر کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا۔ آخر ٹیمز فانڈ نے میز پر... مار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر ان دونوں کے درمیان... شروع ہو گیا۔ پہلے تو وہ کچھ دیر تک ہارتی رہی، پھر اچانک بساط... گئی اور ٹیمز فانڈ دو بجے تک پورے پچاس ملین فرانک ہار گیا۔ ...کے ہونٹوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

ٹیمز فانڈ بغلیں جھانکنے لگا اور تب لڑکی نے سنجیدگی اختیار... قرض کی پیشکش کی۔

"ٹھیک ہے۔" ٹیمز فانڈ نے بے پروائی سے کہا۔ "تم مجھے پچیس... فرانک قرض دے دو۔ میں اس وقت مصلحتاً کیشیر سے نہیں لینا چاہتا۔"

"ایک شرط کے ساتھ۔" لڑکی دلآویز انداز میں مسکرائی۔

"مجھے تمھاری ہر شرط منظور ہے۔ پہلے تم قرض دے دو شرط بعد میں بتا دینا کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ٹیمز فانڈ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ حقیقتاً اب سسپنس کے لمحات شروع ہوئے تھے اور وہ ایسے ہی لمحات میں پے در پے جیتتا چلا جاتا تھا۔

لیکن چونکہ اس نے رات کے کھانے سے قبل والی شراب نہیں پی تھی۔ اس لیے قرض والے پچیس ملین فرانک بھی آدھے گھنٹے کے اندر ہی ہار گیا۔

"اب مزید قرض نہیں دے سکتی۔" لڑکی بولی۔

"خیر کوئی بات نہیں کل دیکھا جائے گا۔"

"اب میری شرط سنو۔ جب تک تم میرے یہ پچیس ملین فرانک ادا نہیں کر دو گے، تمھیں میرے نجی ملازم کی حیثیت سے کام کرنا پڑے گا۔"

"چلو اٹھو۔ میرے گھر چلو۔"

شرط کے سلسلے میں زبان بھی ہار چکا تھا۔ لہٰذا ایک بااصول آدمی ہونے کی بنا پر ٹیمز فانڈ کو اس کے کہنے پر عمل کرنا پڑا۔

دوسری صبح اس نے اپنے چیف سے فون پر رابطہ قائم کر کے اپنی شکست کی داستان سنائی۔

دوسری طرف سے بے حد خشک لہجے میں کہا گیا۔ "محکمہ چھ ماہ تک تمھارا قرض ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔"

پھر وہ چیختا ہی رہ گیا تھا اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

اب وہ مادموزیل ویراں کے نجی ملازم کی حیثیت سے اس کی اقامت گاہ میں مقیم ہے اور ویراں نے اسے مکھی مارنے کے کام پر لگا دیا ہے۔

ویراں کا خیال ہے کہ جراثیم کش ادویات سے فضا گندی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جہاں جو مکھی نظر آئے وہیں ہاتھ ہی سے مار دی جائے۔ ٹیمز فانڈ جو ایک سفاک قاتل بھی ہے اپنے سابقہ تجربات سے دن بھر فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔
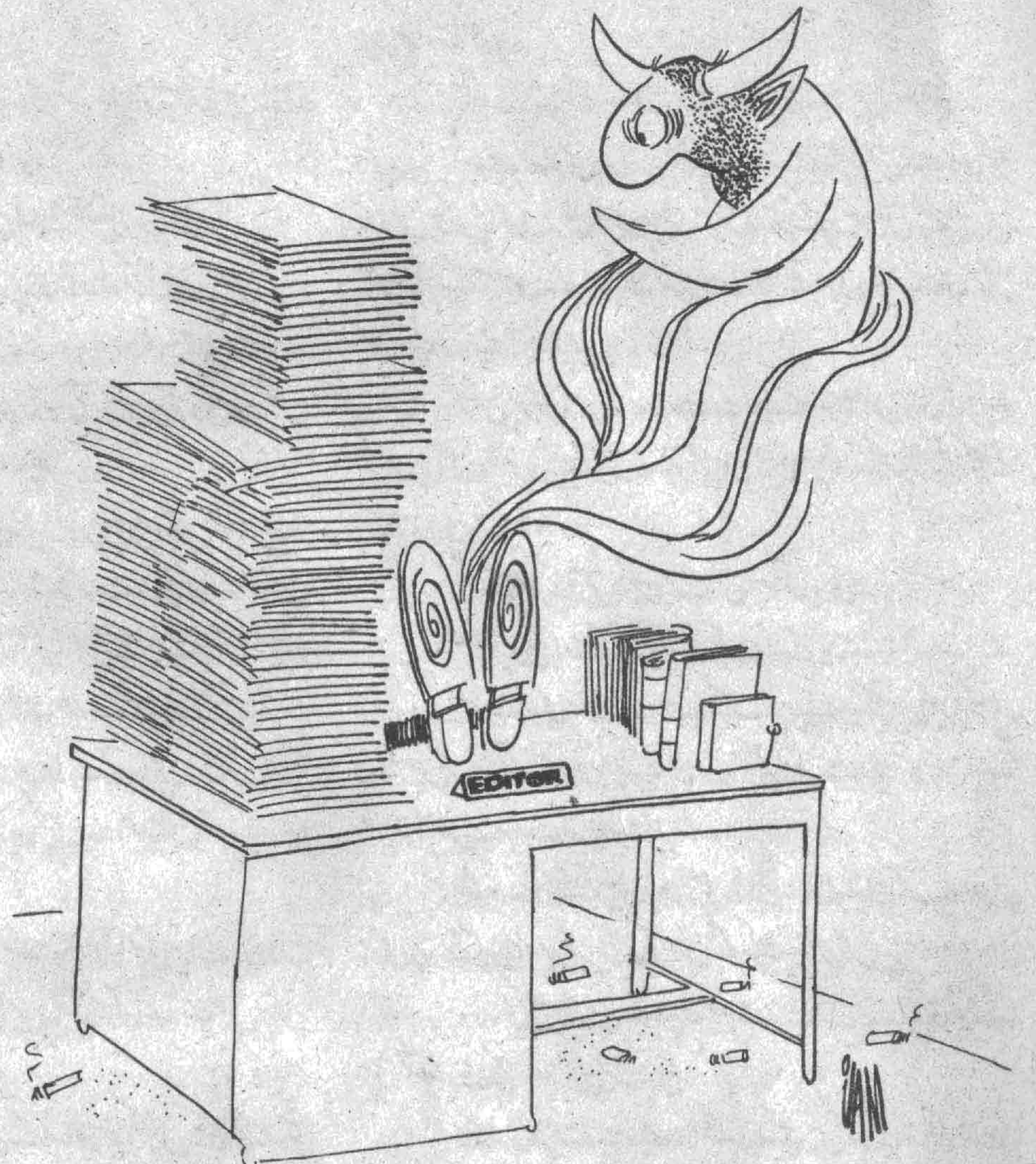
اگر چراغ کا جن قبضے میں آجانے کے بعد الہ دین کے ذہن میں ڈائجسٹ نکالنے کا سودا سما جاتا تو یقین کیجیے، بالکل ایسا ہی ہوتا

چراغ الہ دین ڈائجسٹ

ابنِ صفی

الہ دین ان دنوں شدت سے بور ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے! سب کچھ تو کر گزرا تھا۔ عزت۔ دولت۔ عورت، سبھی کچھ نصیب ہو چکے تھے لیکن زندگی میں کسی نئے پن کو مدت سے ترس رہا تھا۔ معمولاتِ زندگی کے چکر سے کسی طرح بھی نجات ملتی نظر نہیں آتی تھی۔ صبح کو رباب کی مدھم مدھم سی موسیقی بستر سے اٹھاتی۔ ٹوائلٹ کے بعد کنیزوں کے جھرمٹ میں ناشتہ کرتا کیونکہ اس کی زوجہ یعنی بادشاہ زادی تو دس بجے دن تک پڑی سویا کرتی تھی، وجہ یہ تھی کہ اس کے بوائے فرینڈز کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ تین بجے شب سے پہلے محل واپس نہ آتی تھی۔ چار بجے تک سونا نصیب ہوتا۔ دس بجے سو کر اٹھتی تو سب سے پہلے یہ فکر ستاتی کہ کس طرح اپنے شوہر کا نام تبدیل کرائے اور جادوئی چراغ کو دریا برد کرادے کیونکہ اس کے بوائے فرینڈز اسے بیگم چراغ دین کہہ کر چھیڑتے تھے۔

ہاں تو بے چارہ الہ دین ناشتے کے بعد بھی کنیزوں ہی سے دل بہلاتا رہتا۔ لنچ کی میز پر شہزادی صاحبہ سے ملاقات ہوتی۔ اس کے بعد تو قیلولے کے لیے تشریف لے جاتیں اور الہ دین شام کی چائے کے وقت تک چراغ والے جن کے ساتھ شطرنج کھیلتا رہتا۔

حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ جن بور ہوتا رہتا اور شطرنج کی بازیاں رہتیں۔ آخر تھک ہار کر ایک دن اس نے پانسہ پھینکا، کہنے لگا۔

"عالی جاہ۔ جی بہلنے کے دوسرے ذرائع بھی ہیں۔ آخر شطرنج ہی کیوں؟"

"اچھا تو ہی کچھ سمجھا۔ میں تو کلر بلائنڈنس کا شکار ہو کر رہ گیا ہوں۔ ہر وقت آنکھوں میں سرسوں پھولی رہتی ہے۔"

جن بولا۔ "شہزادی صاحبہ بحمد اللہ لٹریری حلقوں میں بے حد مقبول ہو گئی ہیں۔ کیوں نہ ایک ڈائجسٹ نکال دیجیے۔"

الہ دین بھڑک اٹھا اور دانت پیس کر بولا۔ "اچھا تجھے بھی یہ جرأت ہوئی کہ مجھ پر طنز کرے۔"

جن ہاتھ جوڑ کر ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔

الہ دین نے اس کو تو اسی حال میں چھوڑا اور خود بحرِ تفکر میں غرقاب ہو جانے کے لیے پینترے بدلنے لگا۔

جن اس کی اس عادت سے بخوبی واقف تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ گھنٹوں اسی کیفیت سے دوچار رہے گا۔ لہٰذا دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ کر کہنے لگا۔

"میں تو صرف حکم کا غلام ہوں۔ مجھے مشورہ دینے کا حق حاصل نہیں۔ اے میرے آقا! مجھے معاف کر دیجیے۔ آئندہ کوئی مشورہ دوں تو دریا برد کر دیا جاؤں۔"

الہ دین نے اس طرح چونک کر اسے دیکھا جیسے اب تک وہاں اس کی موجودگی سے لاعلم رہا ہو۔

"جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔" وہ ہاتھ ہلا کر دھاڑا اور جن سر پر پاؤں رکھ کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔

دراصل الہ دین اس بے حد معقول مشورے پر تنہائی میں غور کرنا چاہتا تھا۔

بہت دنوں کی بات ہے، جب وہ صرف الہ دین تھا۔ ملک میں صرف ایک ہی ڈائجسٹ باہر سے امپورٹ کیا جاتا ہے۔ نام تھا اس کا ریڈرز ڈائجسٹ۔ اور اس ریڈرز ڈائجسٹ کا اردو میں ترجمہ کرنے کے سلسلے میں الہ دین کبھی سر کے بل کھڑا ہو جاتا اور کبھی مرغا بن کر بانگ دینے لگتا لیکن الفاظ و معنی میں کوئی خوشگوار رابطہ پیدا نہ کر سکتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی "قاری کا ہاضمہ" یا "انہضامِ ناظر"۔ ایک بار تو جھلا کر "قاری ہضم" ترجمہ کر بیٹھا۔ پھر یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک اردو میں بھی ایک ڈائجسٹ ملک ہی میں چھپنا نہیں شروع ہو گیا۔

بڑی خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ لفظ "ڈائجسٹ" کا ترجمہ کرنا چنداں ضروری نہیں "اردو ڈائجسٹ" بھی کانوں کو بھلا لگتا ہے "الم ڈائجسٹ" بھی ٹھیک اور "علم ڈائجسٹ" بھی حسنِ صورت میں اکمل اور سامعہ نواز ٹھہرا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ "ڈائجسٹ" بھی راشن کارڈ ہی کی طرح اردو کا لفظ بن بیٹھا۔ بے شمار ڈائجسٹ نکل کھڑے ہوئے۔ بہتیرے ادبی رسائل نے بھی اپنا ہاضمہ ٹھیک کر لیا۔ یعنی ڈائجسٹوں میں تبدیل ہو گئے۔

لیکن لفظ "ڈائجسٹ" اب بھی الہ دین کے ذہن میں بری طرح کھٹک رہا تھا۔ آخر ڈائجسٹ کیوں؟ ریڈرز ڈائجسٹ کا نام ریڈرز فوڈ بھی ہو سکتا تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا مواد "ذہنی غذا" ہی تو ٹھہرا۔ پھر ایک دم سے ہاضمے کی بات کیوں؟

الہ دین سوچتا رہا۔ بور ہوتا رہا۔ آخر اپنے سر پر دو ہتھڑ مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت ڈائجسٹ کی بات اسی مردود نے چھیڑی تھی۔ ورنہ اچھا بھلا شطرنج کھیل رہا تھا۔ الجھن بڑھتی رہی۔ جھلا کر اس نے جادوئی چراغ نکالا اور اس ناہنجار جن کو طلب کر لیا جو خواہ مخواہ "ڈائجسٹ" چھیڑ کر خود رفوچکر ہو گیا تھا۔

"آقا۔" وہ ہاتھ جوڑے سامنے کھڑا نظر آیا۔

"آقا کے بچے۔ تو نے مجھے کس الجھن میں پھنسا دیا ہے۔ آخر اس قسم کے رسالے ڈائجسٹ کیوں کہلاتے ہیں؟"

"سامنے کی بات ہے میرے آقا۔ ہضم۔ انگریزی، فرانسیسی، جرمن جہاں سے جو کچھ آئے سب ہضم۔ ماہتر لنک کے کسی ڈرامے کو لوکل کلر دیجیے اور اس پر میر کلو مجبر آبادی کا نام ڈال کر ٹھونک دیجیے اپنے ڈائجسٹ میں۔ ماہتر لنک ہضم۔ اب اسکینڈے نیوین کنٹریز کے باشندے اردو تو پڑھتے نہیں کہ انہیں اس پر کوئی اعتراض ہوگا۔ میں کہتا ہوں نکال دیجیے ڈائجسٹ، جی بھی بہلے گا اور آپ عذابِ آخرت سے بھی بچیں گے کہ اب تک ہزاروں بے گناہوں کی گردنیں آپ کی وجہ سے کٹ چکی ہیں۔"

"کیا بکتا ہے۔" الہ دین نے حیرت سے کہا۔ "میری وجہ سے کسی کی گردن کیوں کٹنے لگی؟"

"آپ اتنے بھولے بھی نہ بنیے میرے آقا۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے نوٹ چھاپنے کی کوئی فیکٹری لگا رکھی ہے۔" جن نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

"تو پھر۔" الہ دین اسے بری طرح گھور رہا تھا۔

"بینکوں اور خزانوں سے پار کر لاتا ہوں۔ اسی طرح رقوم غائب ہوتی ہیں تو عملہ بکڑا جاتا ہے۔ لوگوں پر غبن اور سرقے کے مقدمات چلتے ہیں، سزائیں ہوتی ہیں اور ان کے متعلقین ایڑیاں رگڑتے ہیں۔"

"تو یہ سب کیا کہہ رہا ہے۔" الہ دین بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی کا یہ تزک و احتشام، چوری اور لوٹ کھسوٹ کا مرہونِ منت ہے، وہ تو سمجھتا تھا کہ چراغ والا جن جادو کے زور سے اس کے لیے ساری آسائشیں مہیا کرتا رہتا ہے۔

"میں بالکل درست عرض کر رہا ہوں میرے آقا۔" جن دست بستہ بولا... "یقین کیجیے اس میں سرِ مو فرق نہیں۔ پرسوں آپ نے شہزادی صاحبہ کے لیے جو نولکھا ہار طلب فرمایا تھا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ بول۔ وہ کہاں سے آیا تھا۔"

"استنبول کے عجائب گھر سے اڑایا تھا۔ پورے ترکی میں سنسنی پھیل گئی ہے۔ دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔"

"تو نے مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"میرے آقا میں ٹھہرا حکم کا غلام۔ کیا ضروری ہے کہ احکامات کی بجا آوری کا طریقہ بھی گوش گزار کروں؟"

"ہوں، اچھا۔ آئندہ ایسا نہ ہونا چاہیے۔"

"اس کا انحصار آپ پر ہے میرے مالک۔ آپ حکم دینا ترک کیجئے۔ غلام بجا آوری سے باز رہے گا۔"

"ابے تو پھر میں اپنا اسٹیٹس کیسے مین ٹین کروں گا؟"

"ڈائجسٹ نکال دیجئے۔ اس سے صرف ادیبوں کی گردنیں کٹیں گی۔ سو ہمیشہ سے کٹتی آئی ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں۔ ادیب کی گردن کٹنے کا مسئلہ قابل دست اندازی پولیس بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت مقدمہ چل جائے گا جو عموماً باہمی مفاہمت پر ختم ہو جاتا ہے۔"

"بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"اسے یوں سمجھیے کہ اگر کوئی شخص کسی مکان میں نقب لگاتا ہوا نظر آئے گا تو گشتی پولیس اسے فوراً دھر لے گی۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ مالک مکان شکایت کرے تب پولیس متوجہ ہو لیکن آپ کا جب دل چاہے مرزا غالب کی کوئی غزل کسی مشاعرے میں اپنے نام سے پڑھ آیے۔ آپ کے پیچھے نہ پولیس دوڑے گی نہ فوج بلکہ بچے کئی دن تک آپ کے پیچھے تالیاں بجا بجا کر آپ کو محظوظ کرتے رہیں گے۔"

"ارے تو اس کا ڈائجسٹ سے کیا تعلق؟"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کیجئے میرے آقا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ انگریزی کی کسی مخش کہانی کو لوکل کلر دے کر عصمت چغتائی کے نام سے چھاپ دیجئے وہ بھارت میں بیٹھی ہیں، یہاں آپ کا کیا بگاڑ لیں گی۔"

"یہ بات تو ہے۔" الہ دین کچھ سوچتا ہوا سر ہلا کر بولا۔

"موپاساں کی کہانیاں بھی عصمت چغتائی کے نام سے چل جائیں گی اور عصمت کا غرور بھی ٹوٹے گا کہ اللم غلم رسالوں کے لیے نہیں لکھتیں۔"

"لیکن یہاں سب جاہل ہی تو نہیں بستے۔ لوگ ہم پر بہت کڑی تنقید کریں گے!"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ اگلی اشاعت میں چھاپ دیں گے کہ پچاس سال پہلے یہ افسانہ نیرنگِ خیال میں عصمت چغتائی ہی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے موپاساں نے چوری کی ہو۔"

"کیوں بکواس کرتا ہے۔ پچاس سال پہلے تو شاید عصمت کو قلم پکڑنے کی بھی تمیز نہ رہی ہو۔"

"اوہو۔ وہ کوئی اور عصمت چغتائی ہوں گی۔ بس تھوڑے سے ٹیلنٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب چل جاتا ہے، میرے مالک اور پھر میں آدمی تو ہوں نہیں، جن ہوں۔ موپاساں کو اس کی قبر سے نکال لاؤں گا اور اس سے بیان دلوا دوں گا کہ اس نے اس کہانی کا مرکزی خیال اردو سے لیا تھا۔ بس آپ حامی بھر لیجئے۔ باقی کام میں خود کر لوں گا۔"

"ڈائجسٹ کا نام کیا ہوگا؟"

"چونکہ ہم دونوں شرکت میں یہ ڈائجسٹ نکالیں گے لہٰذا اس کا نام چراغ الہ دین ڈائجسٹ ہونا چاہیے۔"

"نام تو شاندار ہے۔" الہ دین خوش ہو کر بولا۔

"کام بھی شاندار ہی ہوگا۔"

"لیکن میں نے سنا ہے کہ یہ سارے ڈائجسٹ محض اشتہارات کے بل بوتے پر چلتے ہیں۔"

"میں نے اس کے بارے میں بھی سوچ لیا ہے میرے آقا! ہم بڑی بڑی پارٹیوں کے اشتہارات مفت چھاپیں گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"ایسا طریقہ کہ خود ہمیں اشتہارات کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کرنا پڑے گی۔"

"او احمق، اشتہارات اس لیے تو چھاپے نہیں جاتے کہ ڈائجسٹ کی ضخامت بڑھ جائے۔"

"میری بات بھی تو سنیئے۔ ہم پہلے ہی شمارے میں اعلان کریں گے کہ یہ ڈائجسٹ صرف عوام کے فائدے کے لیے نکالا گیا ہے۔ اس لیے ادارہ صرف وہی اشتہارات چھاپے گا جو عوام کے لیے فائدہ مند ہوں اور بالکل مفت چھاپے گا۔ مثلاً بکرا مار کہ صابن کر خود دادا کے تجربے میں آچکا ہے عوام کے فائدے کے لیے پیش خدمت ہے بعض حالات میں یہ بالکل جھاگ نہیں دیتا۔ اس سے عوام کو دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے انشاء اللہ اس کا اجر روزِ قیامت ملے گا۔ یقین کیجئے کہ بکرا صابن سے نکل کر سیدھا ہمارے دفتر پہنچ جائے گا۔ دوسرے ڈائجسٹوں کو اگر فی صفحہ تین روپے دیتا ہے تو ہماری خدمت میں ایک ہزار پیش کرے گا۔"

"ابے تو جن ہے یا اوّل درجے کا ڈپلومیٹ۔" الہ دین ہنس کر بولا۔

"شکریہ۔ میرے مالک۔"

"لیکن یہ بھانت بھانت کی اتنی کہانیاں ہر ماہ کہاں سے آئیں؟"

"انگریزی سے۔ کیونکہ دنیا کی ہر زبان کے تراجم انگریزی میں موجود ہیں۔ ہندو دیو مالائی کہانیاں ہندی کے رسائل سے پار کریں گے۔ بس آخر میں اتنا کرنا پڑے گا کہ کوئی مولوی صاحب اپنے علوی عملیات کے ذریعے کالی مائی اور لونا چماری کو شکست دے دیں گے۔ برادران اسلام بھی خوش اور مترجم بھی خوش کہ اس کے مولوی صاحب نے کہانی کو ادبِ عالیہ بنا دیا۔ اگر ذرا ذہین قسم کا مترجم ہوا تو اس کہانی کو [illegible] رنگ بھی دے ڈالے گا۔ آخر میں لکھ دے گا کہ اگر یقین نہ آئے تو [illegible] کے بی ون ایریا میں منشی ملاحت علی نمکین سے مل کر اس [illegible] کی تصدیق کر لی جائے۔ اس کے بعد ہمارا کام ہوگا کہ منشی ملاحت علی نمکین کو اس پر راضی کر لیں گے، وہ اس پر تیار ہو جائیں گے۔ اگر ہم ہر ماہ چراغ الہ دین ڈائجسٹ کی ایک کمپلی منٹری کاپی ان کی خدمت میں بھجواتے رہنے کا وعدہ کر لیں۔"

"واقعی بلا کی کھوپڑی پائی ہے تو نے بھی۔"

"شکریہ۔ میرے مالک۔"

"مگر تو نے کاغذ کے بارے میں بھی سوچا۔ کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔"

"فکر نہ کیجئے۔ پورا پرچہ نیوز پرنٹ پر چھاپیں گے۔"

"کیوں بکواس کرتا ہے۔ کوٹے میں زیادہ سے زیادہ دس ریم کاغذ ملے گا۔"

"دس ریم بہت ہیں۔"

"کیا مطلب؟ ابے دس ریم میں تو ایک ہزار جلدیں تیار ہوں گی۔"

"پانچ سو ریم بلیک میں خریدوں گا... وہ سفید کاغذ سے ارزاں مل جائے گا اور رجسٹروں پر تعداد اشاعت صرف ایک ہزار درج کی جائے گی۔ کون دیکھتا ہے۔ سب چلتا ہے میرے مالک!"

"ابے تجھے تو سیاست میں حصہ لینا چاہیے تھا، چراغ میں کیوں جھک مار رہا ہے؟"

"مقدرات میرے آقا۔"

"اب۔ ایک مسئلہ۔ جو سب سے زیادہ اہم ہے۔"

"کونسا مسئلہ میرے آقا؟"

"شہزادی صاحبہ اور ان کے احباب سے ڈائجسٹ کو کیسے بچایا جائے گا؟"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں میرے آقا دمولائی۔ ارے وہی تو سب کچھ ڈائجسٹ کے لیے لکھیں گے۔"

"ابھی اتنی عقلمندی کی باتیں کر رہا تھا اور اب پھر گدھا بن گیا ہے۔"

"میں نہیں سمجھا، میرے مالک۔"

"اگر انہوں نے چراغ الہ دین ڈائجسٹ کے لیے لکھا تو کوئی نہیں ردی کے بھاؤ بھی نہ پوچھے گا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ وہ سب کافی ہاؤس میں بیٹھتے ہیں اور نظیر اکبر آبادی اور پیلو نرودا لڑایا کرتے ہیں۔"

"آہا۔ آپ سچ مچ، بالکل الہ دین ہی ہیں میرے مالک۔"

"کیا مطلب؟" الہ دین جز بز ہو کر بولا۔

"مطلب یہ کہ آپ ان کے اندرونی حالات سے ناواقف ہیں۔ میں ٹھہرا جن۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ ڈائجسٹوں کے لیے اپنی بیویوں کے ناموں سے لکھتے ہیں اور اچھی خاصی کمائی کر لیتے ہیں۔ بڑھے ہوئے بال تو...... نظیر اکبر آبادی اور پیلو نرودا تو فیشن کی چیزیں ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔"

"سو فیصد یہی بات ہے میرے مالک!"

"بس تو پھر بات پکی۔ ہم ڈائجسٹ ضرور نکالیں گے اور پہلا ہی شمارہ دو لاکھ چھاپیں گے۔"

"اور مفت تقسیم کر دیں گے۔" جن بولا۔

"پھر بے وقوفی کی باتیں شروع کر دیں۔"

"اس سے زیادہ عقل مندی کی بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ پہلا شمارہ مفت تقسیم کر دیں۔"

"کیوں؟"

"اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایجنٹ حضرات پچاس اور ساٹھ فی صد کمیشن کا مطالبہ کر دیں گے۔"

"وہ تو کرتے ہی رہیں گے؟"

"جی نہیں۔ اگر پہلا شمارہ گھر گھر مفت پہنچا دیا گیا تو ایجنٹ صاحبان دوسرا شمارہ ہماری ہی وضع کردہ شرح پر خریدیں گے۔"

"اونہہ۔ ہوگا۔" الہ دین برا سا منہ بنا کر بولا۔ "ایڈمنسٹریشن کی بات تو جانے۔ مجھے اس سے کیا سروکار۔"

"ٹھیک۔ ایڈمنسٹریشن میں آپ دخل اندازی نہیں کریں گے۔"

"منظور۔"

دوسرے دن لنچ کی میز پر شہزادی صاحبہ اخبار دیکھ رہی تھیں۔ اخبارات کی نوبت لنچ پر ہی آتی تھی۔ "چراغ الہ دین ڈائجسٹ" کا اشتہار دیکھ کر بری طرح چونکیں اور الہ دین کو اسی طرح گھورنے لگیں جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" اچانک وہ غرائیں۔

"ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ۔" الہ دین شرما کر بولا۔

"ویسے ہی کیا کم ہنسی اڑاتے ہیں کہ یہ ڈائجسٹ بھی۔ آخر تم اتنا گھٹیا ٹیسٹ کیوں رکھتے ہو؟"

"سب ٹھیک ہے؟" وہ شانوں کو جنبش دے کر بولا۔

"نہیں، میرے شوہر کی حیثیت سے تم ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔"

"اور یہ جو ترقی پسند شوہر بیویوں کے ...

لکھتے ہیں۔"

"کوئی بھی نہیں لکھتا، یہ سراسر اتہام ہے۔"

"محترمہ جلیبی رسدار کا نام سُنا ہے؟"

"ہُوں۔" شہزادی صاحبہ بُرا سا مُنہ بنا کر بولیں۔ "سارے ڈائجسٹوں میں لکھتی ہے۔"

"شاید آپ کو نہ معلوم ہو کہ یہ آپ کے ترقی پسند ادیب شربت تصدیقی کی بیوی ہیں اور خود شربت صاحب لکھتے ہیں اُن کے نام سے۔"

"یہ غلط ہے۔"

"بُلاؤں اپنے جِنّ کو...؟"

"وہ تو تم سے بھی زیادہ لپاڑیا ہے۔"

"اس کی تصدیق اسی طرح ہو سکتی ہے کہ تم شربت تصدیقی کو میرے ڈائجسٹ کے لیے لکھنے کا آفر دو۔ کہہ دینا فی کہانی مبلغ پانچ صد روپے دیے جائیں گے۔"

"اگر یہ جھوٹ نکلا تو...؟"

"میں اپنا نام بدل دُوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" شہزادی صاحبہ بے حد خوش ہو کر بولیں۔ "میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتی کہ تم اپنا نام بدل کر کوئی اچھا سا نام رکھ لو۔"

لیکن شہزادی صاحبہ کی یہ خواہش پُوری نہ ہو سکی۔ پانچ سو روپے کا آفر سُن کر شربت تصدیقی نے سچّی بات اُگل دی تھی۔

اس طرح بڑی آسانی سے لکھنے والوں کا بھی انتظام ہو گیا۔ البتہ انگریزی کی کہانیاں جِنّ ہی منتخب کرتا تھا۔ اصل کام بھی یہی تھا کہ ایسی کہانیاں منتخب کی جائیں جو پہلے کبھی کسی ڈائجسٹ میں نہ چھپی ہوں۔ جِنّ اپنی غیر معمولی قوتوں کو بروئے کار لا کر پتا لگا لیتا تھا کہ کہانیاں اچھوتی ہیں پھر یہ کہانیاں لکھنے والوں میں تقسیم کر دی جاتیں تاکہ وہ انھیں مقامی رنگ دے کر کرتا پاجاما پہنا سکیں۔

کاروبار چل پڑا۔ چھ ماہ کے اندر اندر تعدادِ اشاعت مین لاکھ تک جا پہنچی۔ الہ دین کے وارے نیارے تھے جِنّ کو بھی لوٹ کھسوٹ کرنے سے نجات مل گئی تھی اور اب تو اس کا حُلیہ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ ادیبوں کی سی وضع بنائی تھی اور ہر وقت کسی سوچ میں ڈُوبا رہتا۔ رفتہ رفتہ سو فیصد انٹیلکچوال نظر آنے لگا۔

اب الہ دین کو صرف ایک غم تھا۔ اشتہارات ابھی تک مُفت چھاپے جا رہے تھے۔ مشتہرین میں سے کسی کو غیرت نہ آئی تھی۔

ایک روز اس نے جِنّ سے اس کا تذکرہ کیا اور جِنّ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "دیر آید درست آید۔"

"آخر کتنی دیر آید۔ ایک سال تو ہو گیا۔ کب تک درست آید؟"

"دیکھیے۔" جِنّ سر جھٹک کر بے پروائی سے بولا۔

"میں دیکھ رہا ہُوں کہ تم روز بروز جِنّ کے بجائے ڈرائی جِنّ ہوتے جا رہے ہو۔ یہ بات مجھے قطعاً پسند نہیں۔" الہ دین نے اسے گھورتے ہُوئے کہا۔

"ماحول، یور آنر۔ اب میں ایک لٹریری جِنّ ہُوں۔"

"ہو گا۔ جو چاہو بن جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اب میں اشتہارات نہیں چھاپوں گا۔ انہی صفحات میں کہانیاں جائیں گی۔"

"یہ ناممکن ہے یور آنر۔ آپ ڈائجسٹ کی روایات سے رُوگردانی نہیں کر سکتے۔"

"روایات کی ایسی کی تیسی۔" الہ دین جھلّا کر چیخا۔ "میں روایات کے بغیر ہی اپنا ڈائجسٹ چلا سکتا ہُوں۔"

"بچّوں کی باتیں نہ کیجیے۔ ڈائجسٹ تو میں چلاتا ہُوں۔ آپ صرف مدیرِ اعلیٰ ہیں لیکن اب خدا ہی خیر کرے۔ آپ نے ایڈمنسٹریشن میں دخل اندازی شروع کر دی ہے۔ اپنی تباہی کا سامان خود نہ کیجیے۔"

"بکواس بند کرو۔ اور دفع ہو جاؤ..." الہ دین میز پر ہاتھ مار کر چیخا۔

جِنّ دل برداشتہ ہو کر غائب ہو گیا۔

اس سے گفتگو کرنے کے بعد سے الہ دین عجیب قسم کی ذہنی خلش میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس خلش نے بالآخر اُسے کُرسی سے اُٹھا ہی دیا۔

اپنی مرسیڈیز میں بیٹھا اور آن کی آن میں ایک بڑے مُشتہر کے دفتر جا پہنچا۔ جنرل مینجر نے ہاتھوں ہاتھ لیا کہ پرنس الہ دین کہلاتا تھا۔ تکلفات کا تبادلہ ختم ہوتے ہی الہ دین بولا۔ "وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ آپ کو کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ زندگی بھر اپنے اشتہارات مُفت ہی چھپواتے رہیں۔"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں یور ہائی نس۔" جنرل مینجر نے حیرت سے کہا۔

"آپ کا اشتہار ایک سال سے مسلسل شائع کیا جا رہا ہے لیکن آپ نے ازراہِ اخلاق بھی معاوضے کی پیش کش نہیں کی۔"

"مجھے حیرت ہے، سخت حیرت ہے۔ یقین کیجیے یور ہائی نس آپ کے ڈائجسٹ کو دُوسرے ڈائجسٹوں کے مقابلے میں چوگنا پے منٹ کیا جا رہا ہے۔ ٹھہریے میں ثبوت پیش کرتا ہُوں۔"

اس نے خاموش ہو کر ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھایا اور ماؤتھ پیس میں بولا۔ "اکاؤنٹنٹ، ڈائجسٹوں کا فائل لے کر فوراً آؤ۔"

تھوڑی دیر بعد اکاؤنٹنٹ اندر آیا اور فائل جنرل مینجر کے سامنے رکھ دیا۔ جنرل مینجر نے الہ دین کو وصولیابی کی رسیدیں دکھائیں۔ رسیدوں پر جِنّ کے دستخط تھے اور ڈائجسٹ کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ الہ دین... فائل واپس کر کے پیچ و تاب کھاتا ہُوا اُٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ سارے مشتہرین کے دفاتر میں پہنچا تھا اور چھان بین مکمل کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ناہنجار جِنّ اشتہارات کی وافر آمدنی خاموشی سے ہڑپ کرتا رہا ہے۔

غصّے میں بھرا ہُوا محل واپس پہنچا۔ کچھ دیر ٹہلتا رہا کہ غصّہ کسی قدر کم ہو تو اس ناہنجار کو طلب کر کے باز پُرس کرے۔

بالآخر کچھ دیر بعد وہ الماری کھولی جس میں چراغ رکھا جاتا تھا لیکن دُوسرے ہی لمحے میں زمین پیروں سے نکلتی محسُوس ہُوئی چراغ غائب تھا۔ اس کی جگہ ایک لفافہ پڑا نظر آیا جس پر تحریر تھا۔ "غلام کی طرف سے آقا کے نام۔"

لفافہ چاک کر کے خط نکالا جِنّ نے لکھا تھا۔

"اللہ پاک بالکل درست فرماتا ہے کہ اے مُسلمانو...! دُوسرے مسلمانوں کی ٹوہ میں نہ رہو۔ ورنہ سخت خسارے میں رہو گے۔ میں اپنا چراغ لے کر واپس جا رہا ہُوں۔ چراغ اسی وقت تک صاحب چراغ کے پاس رہتا ہے جب تک صاحب چراغ اس غلام پر اعتماد کرتا ہے۔ اعتماد غائب چراغ گُل۔ اب میں تنِ تنہا ذرا سے آدم سے اپنا ذاتی ڈائجسٹ... نکالوں گا۔ پھر بھی میں آپ کے ساتھ اتنی مروّت کا ثبوت ضرور دُوں گا کہ آیندہ ماہ کا پرچہ مرتب کر کے رکھ جاؤں تاکہ آپ کو بہت زیادہ دُشواری نہ ہو۔ اس کی کتابت شروع کرا دیجیے اور اسی دوران کوئی دُوسرا منتظم تلاش کرتے رہیے تاکہ آپ کا کاروبار جاری رہ سکے۔ خود تو آپ بالکل چغد ہیں۔ الّا ماشاء اللہ۔ خدا حافظ۔"

الہ دین آخری ریمارک پر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ایک خانے میں آیندہ شمارے کا فائل ہاتھ لگا۔ ٹھنڈی سانس لے کر اسے کاتبوں کے حوالے کر دیا۔

شام تک غصّہ ٹھنڈا ہُوا تو الہ دین پر دل کے دَورے پڑنے لگے۔ سارا کام تو جِنّ ہی کرتا تھا۔ خود اُسے قلم پکڑنے کی بھی تمیز نہیں تھی۔ اب ایڈیٹوریل کون لکھے گا۔ کس سے کہہ سکے گا۔ ایڈیٹوریل کوئی اور لکھتا تھا جو اس کے نام سے شائع کر دیا جاتا تھا حالانکہ اگر چاہتا تو شہزادی صاحبہ سے بھی لکھوا سکتا تھا کیونکہ انہوں نے حال ہی میں تھرڈ ڈویژن میں ایم اے اِن اُردو کیا تھا لیکن انھیں بھی نہیں معلوم تھا کہ ایڈیٹوریل جِنّ لکھتا ہے۔ لہٰذا ان کے سامنے شرمندگی اُٹھانے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔

ایک ہفتے تک جھک مارتا رہا لیکن چند سطروں سے زیادہ نہ لکھ سکا۔ پھر ایک نئی تدبیر سُوجھی۔ ایڈیٹوریل کے صفحے کے لیے مندرجہ ذیل سطور لکھیں اور انہیں کاتب کے پاس بھجوا دیا۔

"الہ دین ڈائجسٹ آپ کے لیے نیا نہیں رہا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم بالکل اوریجنل کہانیاں چھاپتے ہیں لہٰذا آج سے ایڈیٹوریل کا ڈھکوسلا ختم کیا جا رہا ہے۔ ہمیں ایک دُوسرے پر اتنا اعتماد تو ہونا ہی چاہیے۔"

پرچہ چھپ کر تیار ہُوا اور تقسیم کر دیا گیا۔

دُوسری صبح الہ دین رباب کے مدّھم نغموں کی بجائے کان پھاڑ دینے والے شور و غل سے جاگا تھا۔ بوکھلا کر خادمِ خصوصی کو طلب کیا جس نے اطلاع دی کہ ایک بہت بڑا احتجاجی جلوس محل کو اپنے نرغے میں لے رہا ہے۔

"وہ گھیراؤ کر رہے ہیں عالی جاہ۔" دوسرے ملازم نے اطلاع دی۔ جو بڑی بدحواسی کے عالم میں دوڑتا ہُوا آیا تھا۔

"کک۔ کیوں؟"

"پتہ نہیں عالی جاہ۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ ہے۔"

الہ دین بھاگ کر کھڑکی کے قریب آیا۔ تب اسے یہ نعرے سُنائی دیے۔

"الہ دین مُردہ باد۔"

"چور صحافت مُردہ باد۔"

"ہمارے پیسے واپس کرو۔"

الہ دین بوکھلا کر پیچھے ہٹ آیا۔

"آخر قصّہ کیا ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے ملازموں سے پُوچھا۔

"وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کی ساری کہانیاں پچھلے ماہ کے دُوسرے ڈائجسٹوں میں چھپ چکی ہیں۔" دوسرے ملازم نے بتایا۔

الہ دین کا سر چکرا گیا۔ اوہ۔ تو۔ اس ناہنجار جِنّ نے اس طرح انتقام لیا ہے۔ اب کیا ہو گا۔ سوچتے سوچتے چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

چاپلوسی

ابنِ صفی
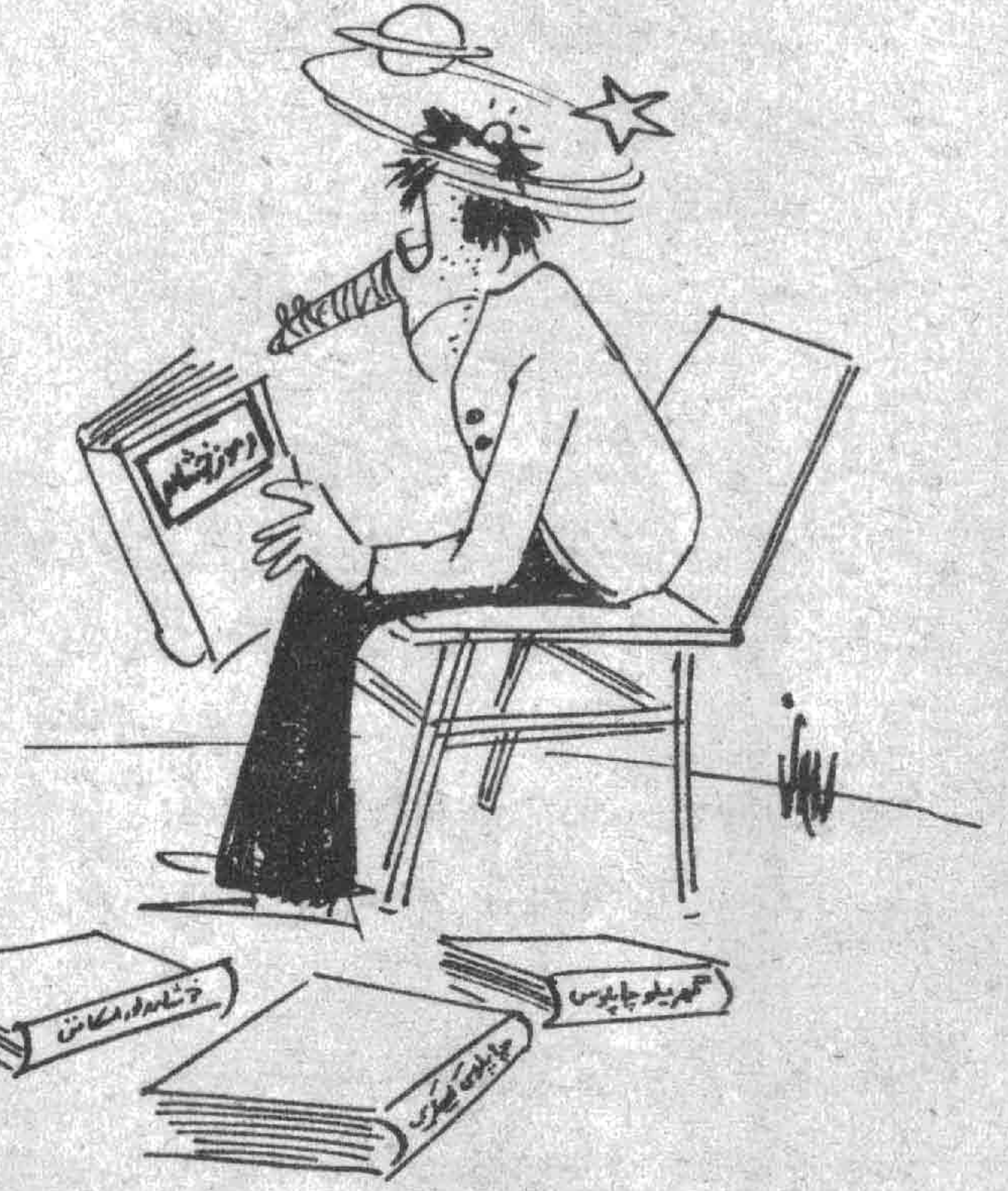
ایک سیدھے سادے سے شخص کی رُوداد جسے حالات نے چاپلوسی سے کام لینے پر مجبور کیا تو اس نے جو انداز اختیار کیا، اسے صرف ابنِ صفی ہی لکھ سکتے ہیں

یقین مانیے ڈاکٹریٹ ملتے ہی میں نے صدر شعبہ اُردو، عربی و فارسی کی موت کی دُعائیں مانگنی شروع کردی تھیں۔ یوں تو میں نے انگریزی اور عربی دونوں مضامین میں ایم اے کیا تھا لیکن ریسرچ کے لیے عربی ہی کو منتخب کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربک ڈپارٹمنٹ کے صدر تقریباً لب گور ہو چکے تھے اور کسی صورت سے بھی یہ اُمید نہیں کی جاسکتی تھی کہ ایک سال سے زیادہ چلیں گے۔ اُن کی موت کے بعد ڈپارٹمنٹ میں ایک لیکچرار کی جگہ خالی ہونی چاہیے تھی۔ لہٰذا اپنی لیکچرار شپ کے خواب دیکھتے ہُوئے میں نے عربک میں ریسرچ شروع کردی۔ قدرت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ اِدھر مجھے [illegible] اُدھر صدر صاحب پر فالج گرا۔ تقریباً ایک ماہ تک میری لیکچرار شپ حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا رہی، پھر وہی ہُوا جس کے لیے میں دو سال تک باقاعدہ قسم کا نمازی بنا رہا تھا۔ اخبارات میں یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی کے لیے ایک لیکچرر کی مانگ شروع ہوتے ہی میں نے وہ عرضی روانہ کردی جو میں نے صدر صاحب کی زندگی ہی میں لکھ کر رکھ چھوڑی تھی۔ شعبے کے نئے صدر نے مجھ سے حتمی وعدہ کیا تھا کہ وہ میٹنگ میں میرے ہی لیے رائے دیں گے مگر اب اسے کیا کیا جائے کہ دوسرے اُمیدوار کے چچازاد بھائی پارلیمنٹری سیکریٹری، دادزاد بھائی منسٹر اور نانازاد پھوپھا ایم این اے تھے۔

یہ تو اپنی اپنی لیاقت کی بات ہے میں ٹھہرا گھامڑ آدمی۔ میں آج تک کوئی ایسا رشتہ پیدا کرنے میں کامیاب ہی نہیں ہُوا جو اس قسم کے نازک مواقع پر میری مدد کر سکے۔ بہرحال کمند اُس وقت ٹوٹی جب نقب زنی کے امکانات بھی ختم ہو چکے تھے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ مجھ جیسے لوگ اپنے ہوائی قلعوں کی کتنی شاندار پبلسٹی کرتے ہیں۔ لہٰذا اسی پبلسٹی کے نتیجے میں دو تین دن تک تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ اُن میں سے تقریباً سبھی کو میری ناکامی پر صحیح معنوں میں افسوس ہُوا تھا کیونکہ یہ سب میری قابلیت کے معترف تھے۔ ان سب کی گفتگو سے میں نے جو نتیجہ نکالا وہ یہ تھا کہ میں انتہائی قابل ہوں۔ اس شہر یا اس ملک تو کیا ساری دُنیا میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ دوسرا اُمیدوار زندگی بھر پڑھے تب بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں لیکچرر نہ ہو سکا محض اس لیے کہ میں انتہائی خوبیوں کے باوجود چاپلوسی نہیں کر سکتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

میرے ایک دوست نے تو نفسیاتی نکتہ نظر سے یہ تک ثابت کردیا کہ زمانے کے اعتبار سے میرا چاپلوس نہ ہونا میری شخصیت کی سب سے بڑی خامی ہے۔ میں اُن کی اِس رائے پر ہفتوں غور کرتا رہا۔ آخر مجھے اس سے متفق ہونا پڑا اور میں نے باقاعدہ طور پر چاپلوس بننے کی مہم شروع کردی۔ مگر خدا کی قسم ایک فیصدی بھی تو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ آپ ہی انصاف فرمایئے جسے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ چاپلوسی کہتے کسے ہیں، وہ اس میں کامیاب کیونکر ہو سکتا ہے؟

ایک دن راہ میں اُن صاحب سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی جنہوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ میرا چاپلوس نہ ہونا میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں نے اُن سے چاپلوسی کرنے کا طریقہ پوچھا۔ پہلے تو بڑی دیر تک میری سادہ لوحی پر قہقہے لگاتے رہے پھر بولے۔

"ارے بھئی، چاپلوسی نہیں جانتے۔ بھئی چاپلوسی یعنی کہ چاپلوسی کیسے کی جاتی ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہاں میں ہاں ملانے کو چاپلوسی کہتے ہیں۔ ہر شخص کی ہاں میں ہاں ملاؤ چاپلوسی خود بخود آجائے گی۔"

"کس طرح ہاں میں ہاں ملائی جائے۔ کوئی مثال دے کر سمجھاؤ۔" میں نے درجہ اوّل کے کسی طالب علم کی طرح بے بسی سے کہا۔

"تم بھی رہے گھامڑ کے گھامڑ۔ مرد آدمی ہاں میں ہاں ملانا بھی نہیں جانتے۔ خیر سُنو، فرض کرو کہ تم اپنے کسی عزیز کی موت پر تعزیت کے لیے جاتے ہو۔ وہاں، مرحوم کا کوئی عزیز اس کے اوصافِ حمیدہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہو کہ مرحوم کے چہرے پر مرنے کے بعد بلا کی رونق تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سو رہے ہوں۔ اس وقت تمہیں چاہیے کہ فوراً اُس کی ہاں میں ہاں ملاؤ اور مرحوم کی بزرگی کا کوئی فرضی قصہ گھڑ کر سُنا دو۔ مثلاً کہو سبحان اللہ مرحوم کی بزرگی کا کیا کہنا۔ ایک واقعہ یاد آگیا۔ میں ایک رات اپنا گدھا تلاش کرتے کرتے قبرستان کی طرف جا نکلا۔ دیکھتا کیا ہُوں کہ مرحوم ایک درخت کے نیچے ننگ دھڑنگ بیٹھے عبادت میں مشغول ہیں اور دو شیر، تین بھیڑیئے، چار اودبلاؤ اور پانچ عدد بچھو مرحوم کے اردگرد حلقہ کیے بیٹھے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ کیا سمجھے؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" میں نے اپنے دوست کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے جوش سے کہا۔ "دوست زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہ بھولوں گا۔ ہاں ہاں بھئی دعوت بھی دُوں گا۔ مجھے مکمل قسم کا چاپلوس تو بن جانے دو، مانتا ہُوں اُستاد۔"

دن بھر ہاں میں ہاں ملانے کے مواقع تلاش کرتا رہا مگر مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ شام کو شکستہ دل ہو کر اخبار اُٹھانے ہی جا رہا تھا کہ ایک صاحب کی موت کی اطلاع ملی۔ مارے خوشی کے ناچ اُٹھا۔ قدرت کچھ مہربان نظر آرہی تھی۔ آخر موقع نصیب ہو ہی گیا۔ سوچا کہ اسی وقت جاؤں مگر پھر خیال آیا کہ شاید اس وقت ہاں میں ہاں ملانے کا موقع نہ مل سکے کیونکہ مرحوم کے اعزا تجہیز و تکفین کے انتظام میں مشغول ہوں گے۔

دوسرے دن انتہائی مسمسی صورت بنائے ہوئے میں ان کے گھر پہنچا اور راستے میں مرگی کا دورہ پڑ جانے کی بنا پر جنازے میں شرکت نہ کر سکنے کی معذرت کی۔ خود پر مرحوم کی بزرگانہ شفقتوں کا تذکرہ کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد مرحوم کے بڑے صاحبزادے نے مرحوم کی طویل علالت اور مرض کی جان لیوا اذیتوں کی داستان چھیڑ دی۔ میرا دل بہت زور سے دھڑکا کیونکہ ہاں میں ہاں ملانے کا یہی موقع تھا۔ میں نے کھولتے ہوئے پیٹ کو دبا کر کہنا شروع کیا۔

"ہاں صاحب خدا بخشے مرحوم نے بڑی تکلیفیں اُٹھائیں۔ بھیا یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ میں نے تو سُنا ہے کہ مرحوم کے جسم کے ریشے ریشے میں کیڑے پڑ گئے تھے۔"

"جی!" مرحوم کے صاحبزادے حیرت سے دیدے پھاڑ کر بولے۔ "بہتان ہے صاحب ہم لوگوں نے تیمارداری میں رات دن ایک کر دیے۔ کیا مجال کہ بدن پر مکھی تک بیٹھ جاتی، کیڑے، لاحول ولا قوۃ۔"

"واللہ عالم بالصواب۔" میں وار خالی جاتے دیکھ کر مایوسی سے بول پڑا۔

"آپ یقین کیجئے۔" ان کے صاحبزادے بولے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہوں گے۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"ارے جناب میں نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ جس وقت مرحوم غسل

کے لیے بستر مرگ پر سے اُٹھائے جارہے تھے ان کی ساری ہڈیاں سُوکھی لکڑی کی طرح تڑاخ تڑاخ ٹوٹ گئی تھیں۔" یہ سُننا تھا کہ ان کے صاحبزادے آگ بگولا ہو کر کھڑے ہو گئے۔ چیخ کر کہنے لگے۔

"کون حرامزادہ کہتا ہے کس سے سُنا ہے آپ نے؟"

"ارے صص۔ صاحب۔ مم۔ مجھے یقین کب آیا تھا۔ بھلا ایسا ہو سکتا ہے۔ دو۔ دُشمنوں کو کیا۔ جج۔ جو۔ چاہا۔ کہہ دیا۔"

"دیکھا رشید صاحب"۔ وہ ایک صاحب کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔

"آپ بھی تو غسل کے وقت موجود تھے۔ (میری طرف مخاطب ہو کر) ذرا بتایئے تو کس نے کہا ہے آپ سے؟"

"ارے جانے بھی دیجئے"۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ "دشمنوں کا کیا ہے، یونہی اپنا منہ کالا کرتے ہیں۔ بہرحال میں اُن صاحب کی اچھی طرح خبر لوں گا۔"

نہ جانے کس طرح پیچھا چھڑا کر وہاں سے بھاگا۔ بسم اللہ ہی غلط نکلی۔ مگر میں آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ایک بار ناکام ہونے پر سپر ڈال دینا کوئی مردانگی نہیں ہے۔

میں مرتے دم تک جدّوجُہد کرتے رہنے کا قائل ہُوں۔ میری راہ میں اگر ہمالیہ بھی حائل ہو تو پرَوا نہیں کرتا۔ تقدیر کو ناکامیوں کا سبب نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ بعض عملی خامیاں ہی ناکامیوں کو جنم دیتی ہیں۔ میں دوسرے بہتر مواقع کا انتظار کرنے لگا۔

ایک دن پھر ایک بزرگ کی موت کی خبر ملی۔ احتیاطاً میں نے تعزیت کئی دنوں کے لیے ٹال دی اور اس دوران میں مختلف قسم کے تعزیتی موضوعات پر مکالمے لکھ لکھ کر رٹتا رہا۔ بہرحال اچھی خاصی تیاری کے بعد وہاں پہنچا۔ کئی حضرات وہاں موجود تھے۔ مرحوم کے اوصافِ حمیدہ گنوانے شروع کیے۔ میں نے کئی بار ہاں میں ہاں مِلانے کی کوشش کی لیکن وہ طوفان ایکسپریس کی رفتار سے جارہے تھے۔ خدا خدا کر کے رُکے بھی تو اس جملے پر "مرحوم کی خوبیاں کہاں تک بیان کی جائیں۔ وہ بچّوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بُوڑھوں میں بُوڑھے تھے"۔ گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں مجھے یاد نہ رہ سکا کہ وہ اس سے پہلے کیا کہہ چکے ہیں۔ حالانکہ اسے یاد رکھنا ضروری تھا کیونکہ اس قسم کے جملے پر میں نے کوئی تیاری نہ کی تھی ایک سیکنڈ، دو سیکنڈ، تین سیکنڈ۔ کتنا اچھا موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ اگر گفتگو کا موضوع بدل گیا تو کیا ہو گا۔ اس خیال نے بولنے پر اُکسا دیا۔

"ارے صاحب بچّوں میں واقعی بچے تھے"۔ میں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "میرے بچّے کو بے حد عزیز رکھتے۔ کیا کیا قلابازیاں کھاتے

تھے، اس کے ساتھ۔ اُف جس وقت وہ ہنسنے گا۔ ارے صاحب کیا بتاؤں کہ اسے کس قدر عزیز رکھتے تھے۔ ایک دن بچّے نے ان سے کہا کہ گھوڑا بنو۔ آپ جھٹ اپنے پیچھے آزار بند کی دُم لگا کر گھوڑا بن گئے۔ بچّے نے ڈاڑھی پکڑی اور ٹخ ٹخ کر کے دوڑایا۔۔۔

۔۔۔ ہائے کیا بزرگ تھے۔"

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ کئی حضرات کو ہنسی آگئی۔ میں نے مرحوم کے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا جو مجھے عجیب نظروں سے گھور رہے تھے۔ لوگوں کے قہقہے سُن کر چونکے اور خود بھی کھسیانی ہنسی ہنس کر کہنے لگے۔ "صاحب کیا بتاؤں کتنے زندہ دل تھے۔"

اُن کا یہ جملہ سُن کر میرا دل خوشی سے بلّیوں اُچھلنے لگا۔ تیر نشانے پر لگا تھا مگر شاید "نیم کش"۔ چونکہ کافی حوصلہ افزائی ہو گئی تھی اس لیے میں نے فوراً ہی دوسرا جگر پار ہو جانے والا تیر چھوڑا۔

"ہائے وہ جوانوں کے جوان تھے"۔ میں نے نتھنے پُھلا کر آنسو نکالنے کی کوشش کرتے ہُوئے کہا۔ "کیا عرض کروں۔۔۔ ہائے، ایک دن مُنّی بائی کے کوٹھے پر مرحوم سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ مجھے دیکھ کر ذرہ برابر بھی نہ ہچکچائے۔ میں اُلٹے پاؤں لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا ———— کہ مجھے کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ مرحوم اس وقت شراب پی رہے تھے کوئی اور گلاس موجود نہ تھا اپنا ہی گلاس میرے آگے بڑھا دیا۔ ہائے اب ایسے لوگ کہاں۔ ہائے اس بڑھاپے میں بھی مُنّی بائی اُن پر کئی ہزار جان سے عاشق تھی۔ اُف۔"

کھی کھی کی آوازیں دوبارہ بلند ہُوئیں اور پھر ایک گرج سُنائی دی۔ دوسرے لمحے مرحوم کے چھوٹے بھائی کا ہاتھ میری گردن پر تھا اور مَیں خود سڑک پر۔۔۔

اس بار بھی غالباً کوئی خاص خامی رہ گئی تھی خیر کوئی پرَوا نہیں۔ کوئی بھی آرٹ جلدی سے نہیں آجاتا، برسوں کے ریاض کے بعد مہارت نصیب ہوتی ہے۔ اسی شام کی بات ہے کہ میں کلب میں بیٹھا بُرج کھیل رہا تھا، قریب کی میز پر ایک خاتون جو اچھی خاصی مشہور قسم کی افسانہ نگار ہیں، خاکسارانہ انداز میں لوگوں سے اپنے افسانوں کی داد وصول کر رہی تھیں۔

"واقعی آپ غضب کا لکھتی ہیں"۔ دوسرے صاحب نے کہا۔

"بعض اوقات تو سچ مچ کمال کر دیتی ہیں"۔ دوسرے نے کہا۔

"ارے کیا میں اور کیا میرے افسانے۔"

محترمہ جھینپیں "یُوں ہی ٹُوٹا پھُوٹا لکھ لیتی ہوں۔"

میں نے تاش کے پتّے میز پر رکھ دیے اور پیشانی سے پسینہ پُونچھنے لگا۔ میرا دل شدّت سے دھڑک رہا تھا۔ موقع شناسی کی رگ پھڑک اُٹھی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہتیں میں بول پڑا۔

"واقعی آپ اتنا ٹُوٹا پھُوٹا لکھتی ہیں کہ بعض اوقات دو جملوں کا درمیانی فاصلہ ناپے بغیر قاری آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ ایک صاحب تو یہاں تک کہہ رہے تھے کہ آپ کا کوئی افسانہ مکمل ہی نہیں ہے۔"

"جی!" وہ صاحبہ ہونٹ بھینچ کر گرم لہجے میں بولیں۔ "کیا آپ کسی افسانے کے بارے میں ثابت کر سکتے ہیں۔"

ان کے کڑے تیور دیکھ کر میں بوکھلا گیا۔ یوں بھی عورتوں سے خائف رہتا ہوں خصوصاً جب عورت غصے میں ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کہوں۔ بہرحال کچھ نہ کچھ کہنا ہی تھا لہٰذا میری لڑکھڑاتی ٹُوٹی زبان کا چرخہ چل پڑا۔ "آپ غلط سمجھیں۔ میں تو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے افسانے بالکل لغو اور لچر۔ ارے توبہ۔ لاحول ولا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ آپ بالکل۔ بل بِل بِل بالکل گدھی۔ ارے لاحول"۔ میں نے اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا۔

"شٹ اپ"۔ اُن کی سُریلی آواز امریکن انجن کی کریہہ الصوت سیٹی کی طرح گونج اُٹھی۔

بعد میں سُنا ہے کہ وہ مجھ پر ہتک عزت کا دعویٰ کرنے والی ہیں۔

اس قدر حوصلہ شکنیوں کے بعد بھی میرے عزم و استقلال کا وہی حال تھا اور یہی چیز مجھے اس بات کا یقین دِلا رہی تھی کہ ایک نہ ایک دن مرکزی حکومت کے کسی شعبے میں کسی بڑے عُہدے پر فائز ہونے کا موقع مل جائے گا۔ اچھا ہی ہُوا جو میں لیکچرار نہ ہو سکا۔

اس سلسلے میں اپنے تجربات کہاں تک گنواؤں کیونکہ فہرست بہت طویل ہے۔ چلتے چلاتے صرف ایک واقعہ اور بیان کروں گا تاکہ آپ بھی اس سے سبق حاصل کر سکیں اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں محض اس لیے لکھتا ہوں کہ بہتوں کا بھلا اس کے پڑھنے سے ہو گا۔

نہ تو میں شہرت کا بھُوکا ہوں اور نہ مضامین کے معاوضے کا۔ کیونکہ شہرت کھانے سے اکثر بدہضمی ہو جاتی ہے اور معاوضہ۔؟ یہ مغربی لعنت ہے۔ اس کا دستور صرف مغربی ممالک میں ہے۔ اپنے یہاں بھی بعض جرائد لکھنے والوں کا پیٹ پالتے ہیں، ہمیں ہر قسم کی مغربی لغویات سے باز آجانا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہُوا تو ہمارا ہر ادیب راک فیلر اور ہنری فورڈ ہو جائے گا۔ پھر رسائل کا جو انجام ہو گا وہ ظاہر ہے۔ اس لیے ازراہِ دُور اندیشی معاوضے قطعی بند۔ لاحول ولا قوۃ۔

کہاں کی بات کہاں نکل آئی۔ ہاں تو میں اپنا ایک بہت ہی ہمت شکن اور صبر آزما تجربہ بیان کرنے جا رہا تھا۔ ہُوا یہ کہ محلے کی ایک معمّر دوشیزہ ایک نابالغ لڑکے کو اغوا کر کے لے گئی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ایسے مواقع پر کیا کچھ نہیں ہوتا۔ محلے میں کئی محاذ قائم ہو گئے۔ ہر محاذ پر ہر وقت دو چار مجاہد موجود رہتے اور کچھ اس قسم کی دل ہلا دینے والی گفتگو کرتے کہ ہر لحظہ آفتاب سوا نیزے پر آتا معلوم ہوتا۔ بھلا بتایئے کہ میرے لیے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا تھا اور پھر مجھے دل کی بھڑاس بھی تو نکالنی تھی۔ آخر اس نامعقول عورت نے اس نیک کام کے لیے اُسی لڑکے کو کیوں منتخب کیا۔ کیا میں... خیر جانے دیجئے آپ خود دستائی سمجھیں گے۔

بہر حال کہنے کا مطلب یہ کہ مجھے بھی اس جہاد میں حصّہ لینے کی ٹھان کر گھر سے نکلنا پڑا۔ گلی کے موڑ پر پان والے کی دکان کے قریب تین چار مجاہد نظر آئے۔

"کچھ سُنا آپ نے؟" ایک صاحب مجھے دیکھ کر بولے۔

"ہاں صاحب سُنا؟"

میں نے اپنے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں جناب!"

"ارے صاحب دِلّی لُٹی، لاہور برباد ہُوا، اب اس شہر کی باری ہے" خان صاحب اپنی ابابیلی مونچھیں پھڑکاتے ہوئے بولے۔ "اس پر بھی قہرِ الٰہی نازل ہو گا"

"دہلی کا بھی عجیب عبرتناک واقعہ ہے" ایک صاحب نے کہا۔ سُننے میں آیا ہے کہ جب دِلّی لُٹ چکی تو کچھ باایمان لوگ ایک بزرگ کے پاس گئے اور اُن سے دِلّی کی تباہی کی وجہ پُوچھی۔ انہوں نے جواب دیا۔

"فلاں محلے میں کل ہی ایک بچّہ پیدا ہُوا ہے اس سے جا کر پُوچھو کہ تم کس کی اولاد ہو...؟

... تمہیں خود بخود دِلّی کی تباہی کا راز معلوم ہو جائے گا چنانچہ لوگ بتائے ہوئے پتہ پر گئے۔ واقعی وہاں پر ایک بچّہ پیدا ہُوا تھا۔ ایک مردِ صالح نے بزرگ کے سوال کو بچّے کے سامنے دُہرایا، بچّہ بعد حمد و ثنا کے گویا ہُوا کہ وہ اپنے سگے ماموں کی اولاد ہے۔ اب آپ خود خیال فرمایئے۔ توبہ توبہ۔ معاذ اللہ

دِلّی کیوں نہ لُٹتی۔ خُدا کا قہر کیوں نہ نازل ہوتا"

جُملہ حاضرین اس بیان پر انگشت بدنداں رہ گئے... اور میں تو جھُوم اُٹھا... دل نے کہا او ناہنجار اسے کہتے ہیں ہاں میں ہاں ملانا۔ میں نے دل سے کہا ٹھہر جاؤ دوست اگر اس سے زیادہ شاندار طریقے پر ہاں میں ہاں نہ ملائی تو کچھ نہ کیا۔

"ہاں میاں کلجگ ہے کلجگ"

خان صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے "جب تک ہمارے گھروں کا رکھ رکھاؤ ٹھیک نہ ہو گا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت بہت ضروری ہے۔ میں تو جناب سختی سے کام لیتا ہوں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ میری لڑکیاں اپنے خالہ زاد بھائیوں سے پردہ کرتی ہیں"

میں سمجھا تھا کہ ابھی کچھ اور کہیں گے مگر خان صاحب اسی جملے پر رُک گئے۔ میں اچھی طرح تیار نہ ہو پایا تھا۔ اگر بولنے سے پہلے سوچنے لگتا تو ممکن تھا کہ کوئی دوسرا اس زرّیں موقع سے فائدہ اُٹھا لیتا اس لیے میں بول پڑا۔

"ارے خان صاحب یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بھلا آپ کے یہاں کی مستورات کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ میر جمن صاحب بس آپ سے کیا عرض کروں، ابھی پرسوں کی ہی بات ہے کہ خان صاحب کی بڑی صاحبزادی کوٹھے پر کھڑی تھیں، میری نظر پڑ گئی چھُٹتے ہی آنکھ مار دی اور سینے پر ہاتھ مار کر دو چار عشقیہ اشعار بھی پڑھے۔ مگر واہ۔ لڑکی ہو تو ایسی ہو۔ وہ دن ہے اور آج کا دن پھر صاحبزادی کوٹھے پر نظر نہیں آئیں۔ اور خان صاحب کی بہو کا واقعہ..."

"ٹھک...!"

کان کے قریب آواز سُنائی دی، سر چکرایا۔ اور پھر آنکھ کھُلی تو میں خانصاحب سے دس گز کے فاصلے پر نالی میں پڑا ہُوا تھا۔ اب سمجھا کہ معاملہ کیا تھا۔ مگر واہ ری ہمت میں نے یہ زرّیں موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور کنپٹی سہلاتا ہُوا بولا۔

"واہ خان صاحب کیا مُکّا عنایت کیا ہے آپ نے ارے اس وقت تو رستم کا پتہ بھی پانی ہو جاتا۔ اور۔ پھر اس سے آگے کہنے کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ ٹھک ٹھک کی بے شمار آوازیں میرے کانوں میں گونج اُٹھیں اور چالیس تک گننے کے بعد میں اچانک گنتی بھول گیا۔

اس وقت میں خیراتی اسپتال کے جنرل وارڈ کے ایک جھلنگے پر چت لیٹا ہُوا ببانگِ دُہل اعلان کرتا ہُوں کہ میری ہمت اب بھی پست نہیں ہُوئی۔ اب تو مجھے ضد سی ہو گئی ہے۔ اگر زندہ رہا (کیونکہ اس کے امکانات کم ہیں) تو یہاں سے چھُٹکارا پاتے ہی چاپلوسی شروع کر دوں گا۔

اے میری عظیم ترین رُوح میں تجھے سلام کرتا ہُوں۔
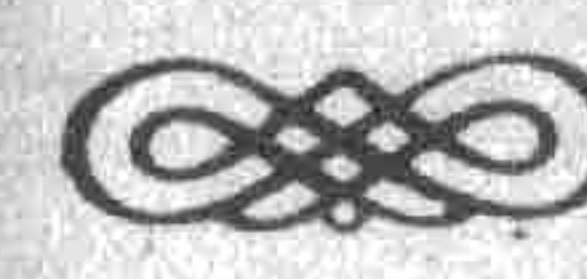
شکاریات پر آپ نے بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی ۱۹۱ ممکن ہے خود آپ کو بھی کبھی شیر کا شکار کرنے کا شوق چرانے لگے اس لیے پہلے یہ کہانی ضرور پڑھ لیں

ابنِ صفی

شیر کا شکار

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب زیادہ تر ادبی رسائل دم توڑ رہے تھے۔ چند سال پہلے جاسوسی ناولوں کی وبا آئی تھی اور اُن کی آبادی کا تقریباً نصف حصّہ موت کی گود میں جا سویا تھا۔ جو باقی بچے تھے جیسے تیسے زندگی گزار رہے تھے کہ کچھ دنوں کے بعد اچانک انھیں "ڈائجسٹ" ہونا شروع کیا۔ یہ بیماری نتیجہ تھی علمی، ادبی، سائنسی، ثقافتی بدہضمی کا۔ اس بیماری کی ابتدا "شکاریات" کے تشنج سے ہوتی ہے۔ رسالے پر کبھی کبھی شکاریات کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اُسے پُوری طرح "ڈائجسٹ" ہو جاتا ہے۔

ہمارے رسالے کا بھی یہی حشر ہونا مقدّر ہو چکا تھا۔ لہٰذا ایک دن ایڈیٹر صاحب آپے سے باہر ہو کر بولے "شکاریات کے بغیر رسالے کا زندہ رہنا ناممکن ہے"

میں نے کہا "عالی جناب۔ تو پھر ہم کسی شکاری سے بات چیت کریں"

"یار کیوں بچّوں کی سی بات کرتے ہو" وہ جھنجلا کر بولے۔

"شکاریوں کو لکھنا کب آتا ہے؟"

"ارے صاحب! وہ فوارہ ڈائجسٹ ہے۔"

"بس، بس۔ فضول باتیں نہ کرو۔" انھوں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "وہ سب تمھارے جیسے موٹے لکھنے والے ہیں۔ پہلے لکھنے کی مشق کرتے ہیں پھر شکار کھیلتے ہیں۔!"

مجھے غصّہ آگیا اور میں نے کہا۔ "میں بھی لکھنے کی اتنی مشق بہم پہنچا چکا ہوں کہ شکار کھیلے بغیر ہی لکھ سکتا ہوں۔"

"صاحبزادے ہو۔ کہیں نہ کہیں ایسی ٹھوکر کھاؤ گے کہ بس ــ ابھی پچھلے ہی دنوں غبارہ ڈائجسٹ میں کسی نے شیر کو چھچھوندر نگلتے دکھایا تھا اور تحقیق فرمائی تھی کہ چھچھوندر نگل لینے کے بعد شیر اندھا ہو جاتا ہے۔ پھر اُسے جیسے چاہو مار لو۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اللہ میں بڑی شان و قدرت ہے۔ جیسے ہاتھی کو چیونٹی سے زیر کرا دیتا ہے۔ اسی طرح شیر کو چھچھوندر۔"

دھاڑ کر بولے۔ "اے تم بھی اُسی قبیل کے مصنف ہو کیا؟"

میں نے کہا۔ "جی میں نہیں سمجھا؟"

وہ مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے رہے۔ پھر سگریٹ سُلگائی، کُرسی کی پُشت گاہ سے ٹِک کر دو تین کش لیے۔ تب کہیں جا کر اُن کی تیوریاں ٹھیک ہوئیں اور انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "برخوردار! تجربے کے بغیر کچھ لکھنا فضول ہے ـــ ایسے میں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اب دیکھو مس جین ڈولنگر ہیں نا۔ جنگلوں میں ماری ماری پھرتی ہیں اور پھر جب مضمون لکھتی ہیں۔ تو بس۔"

یہاں انھوں نے خاموش ہو کر اتنی زور سے دانت بھینچے کر جبڑوں کی وریدیں اُبھر آئیں۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "ٹھہرو، میں تمھیں دکھاتا ہوں۔"

اُنھوں نے میز کی دراز کھینچ کر چھوٹے سائز کا فائل کور نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ "دیکھو۔"

میں نے فائل کھولا۔ مس جین ڈولنگر کی بیشمار تصاویر تھیں جو کسی اخبار سے کاٹ کر نکالی گئی تھیں۔ واقعی ایسی ہی تصویریں تھیں کہ بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

"دیکھا؟" کچھ دیر بعد اُن کی آواز پر چونک پڑا۔ ورنہ میں تو چونکنے پر بھی تیار نہیں تھا۔

"اِدھر لاؤ۔" اُنھوں نے فائل . . . میرے ہاتھوں سے جھپٹ کر دوبارہ دراز میں مقفّل کر دیا۔

"تک ۔ کیا۔ آپ ان تصویروں میں سے کچھ تصویریں مجھے نہیں دے سکتے؟" میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"جی نہیں!" اُن کے لہجے میں فیصلہ کن تھا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ پھر جیسے مجھے ہوش آگیا اور میں نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ پُوچھا۔ "مگر جناب مضامین۔ اُن کے مضامین کہاں ہیں؟"

بے پروائی سے بولے۔ "پتہ نہیں۔" اور جلدی جلدی سگریٹ کے کش لینے لگے۔ تھوڑی دیر تک ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ پھر میں نے کہا۔

"لیکن جناب ... قصّہ تھا شیر کے شکار کا۔"

"ہاں کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ایسے مضامین لکھو شکاریات پر کہ تمھاری تصویروں کے بھی اسی طرح فائل بن ٹین کیے جاسکیں۔"

"جی میں لنگوٹی میں تو ہرگز تصویر نہ کھنچواؤں گا۔" مجھے غصّہ آگیا۔

"فکر نہ کرو رائفل بھی تو ہوگی ہاتھ میں۔"

"ہاں۔ یہ بات ہے تو۔" میں نے گویا سپر ڈال دی۔

لیکن وہ اُنگلی اُٹھا کر بولے۔ "تجربہ شرط ہے۔ تجربے کے بغیر۔ . . ."

"جی ... نہیں ..." میں بوکھلا کر بولا۔ "تو کیا مجھے شیر کا شکار بھی کھیلنا پڑے گا؟"

"بالکل۔ بالکل۔" وہ میز پر ہاتھ مار کر بولے۔ "عنقریب کلیم کا روپیہ ملنے والا ہے۔ میں تمھارے لیے شکار کا انتظام کر دوں گا۔ بھئی یہ مغربی ممالک کے رسائل ایسی اسکیموں پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ تب کہیں جا کر کامیابی نصیب ہوتی ہے۔"

"مگر دیکھیے تو۔" میں نے تھوک نگل کر کہا۔ "مجھے کئی درجن پتلونیں سلوانی پڑیں گی۔ تب کہیں جا کر ایک آدھ کامیابی نصیب ہوگی۔"

جھنجلا کر بولے۔ "ایک بار کہہ دیا کہ کلیم کا روپیہ..."

"جی بہت اچھا ... بہت بہتر.." میں نے بوکھلا کر انھیں جملہ پورا نہ کرنے دیا۔

انھوں نے دونوں ٹانگیں اُٹھا کر میز پر پھیلا دیں اور اُونگھنے لگے۔ غالباً وہ کلیم کے روپے کے دوسرے مصارف پر بھی غور کرنے لگے تھے۔

میں اس معاملے میں اُن سے کمزور نہیں تھا۔ اگر وہ کلیم کے روپوں کے خواب دیکھ سکتے تھے تو میرے پاس بھی دس روپے والا ایک عدد پرائز بونڈ تھا۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں ... اور اُن بیس ہزار روپوں کے بارے میں سوچنے لگا جو اگلی قرعہ اندازی میں میرے نام نکلنے والے تھے۔ بیس ہزار۔ ایک اچھی اور دودھ دیتی بھینس پانچ سو میں آتی ہے۔ لہٰذا دس ہزار میں بیس بھینسیں آئیں گی۔ اگر فی بھینس دس سیر دودھ بھی رکھ لیا جائے تو بیس بھینسوں سے دو سو سیر دودھ روزانہ حاصل ہوگا۔ اس طرح ایک روپے فی سیر کے حساب سے دو سو روپے یومیہ ہاتھ آئیں گے۔ بھینسیں زیادہ سے زیادہ سو روپے یومیہ کھا جائیں گی، اور سو روپے یومیہ کی بچت ہوگی۔ چھتیس ہزار روپے سالانہ کی یافت۔ میرے اخراجات زیادہ سے زیادہ چھ ہزار روپے سالانہ ہوں گے ـــ تیس ہزار روپے سالانہ کی بچت ـــ اوہ... اوہ... اِس طرح میں پانچ سال کے اندر فلم پروڈیوسر بن سکوں گا۔ اپنے سرمائے سے فلمیں بنا سکوں گا اور بیٹے ایڈیٹر صاحب! تم اس وقت تک سبزی فروش بن چکے ہوگے یا کسی فٹ پاتھ پر پُرانے رسائل، دُو دُو آنے کی صدائیں لگا رہے ہوگے ـــ ہاہا ... کیا رکھا ہے، ادب وَدب میں۔ ادیب ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ "ڈیری فارمنگ" کی جائے۔ ادیب تو نہ دین کا نہ دُنیا کا۔ ہر سال سینکڑوں دودھ والے حج بھی کر آتے ہیں اور بڑی شاندار کوٹھیاں بنواتے ہیں۔ دین بھی کماتے ہیں اور دُنیا بھی ـــ اور یہ ـــ شیر کا شکار ـــ کئی درجن پتلونیں ـــ شیر ـــ شیر ـــ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

اور پھر وہ وقت بھی آ ہی گیا جب دُنیا بھر کے اخباروں میں ماہنامہ "آفاقی ادب" کی طرف سے یہ اشتہار شائع ہُوا۔

"ساری دُنیا کے باشندوں سے درخواست ہے

کہ اگر کہیں کوئی لاگو اور آدم خور قسم کا شیر موجود ہو تو ماہنامہ "آفاقی ادب" کے مدیرِ معاون حضرت ہُدہُد سلیمانی کو فوراً مطلع فرمائیں ـــ"

اشتہار شائع ہونے کے تیسرے ہی دن سے اطلاعات موصول ہونے لگیں۔

ایڈیٹر صاحب نے فرمایا۔ "رختِ سفر باندھو میاں ہُدہُد سلیمانی!"

میں نے کانپتے ہوئے کہا۔ "یہ تو سچ ہے ـــ اگر سچ مچ شیر آگیا تو کیا ہوگا؟"

اُنھوں نے فوراً ہی مس جین ڈولنگر کی ایک خاص الخاص تصویر نکال کر میرے حوالے کی اور بولے۔ "جب بھی خوف معلوم ہو، نکال کر دیکھ لینا۔ شرم بھی آجائے گی اور طبیعت کو سُرور بھی حاصل ہوگا۔"

بہرحال پروگرام کے مطابق پہلا شیر اپنے ہی ملک میں مارنا قرار پایا تھا۔

بذریعہ ہوائی جہاز مشرقی صوبے میں پہنچا، جہاں سے اطلاع ملی تھی۔ جائے واردات پر پہنچ کر متحیّر ہی ہو جانا پڑا۔ لوگوں کو دیکھا کہ اپنے ریڈیو سیٹ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ ایک آدمی جا بجا اپنا ریڈیو سیٹ زمین میں دفن کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر اچھل پڑا اور بیحد خوش ہو کر بولا۔ "آپ وہی شکاری ہیں نا جس نے اشتہار دیا تھا؟"

اثبات میں جواب سُن کر اُس نے اور زیادہ خوشی ظاہر کی۔ کہنے لگا۔ "صاحب اگر آپ نے اس شیر کو مار لیا تو ساری دُنیا میں نام ہو جائے گا آپ کا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ وہ اب تک کتنی وارداتیں کر چکا ہے؟"

"پندرہ ـــ!"

"اوہ ..." میں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔ "کیا سب مَر گئے؟"

"وہ جنھیں اس شیر نے ..."

"آپ غلط سمجھے ..." وہ جھینپی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "اُس نے کسی آدمی یا جانور پر حملہ نہیں کیا۔ وہ تو صرف ریڈیو سیٹ اُٹھا لے جاتا ہے۔"

"تم نشے میں تو نہیں ہو۔" مجھے غصّہ آگیا۔

"کسی اور سے پوچھ لیجیے جا کر۔" اُس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ اور پھر مٹی کھودنے لگا۔ عجیب خبطی سے سابقہ پڑا ہے ـــ میں نے سوچا اور آگے بڑھ گیا۔ پھر وہ سب ہی خبطی ثابت ہوئے کیونکہ انھوں نے اس کے بیان کی تردید نہیں کی تھی۔ میں نے کہا۔ "یا خدا ابھی سے سسپنس شروع ہو گیا۔ شیر اور ریڈیو سنسنی ـــ حیرت انگیز ـــ آخر ریڈیو کیوں! یہ کون ہے ـــ کیا واقعی شیر ہے یا کوئی سرکاری جاسوس جو شیر کی کھال اوڑھ کر بغیر لائسنس کے ریڈیو چھین لے جاتا ہے۔"

میں حیرت اور سنسنی کے سمندر میں غوطے لگاتا ہُوا، ڈاک بنگلے تک آیا۔ بستی کے بیکار اور اوباش لوگوں کا جمِ غفیر میرے پیچھے تھے۔

رات بڑی بے چینی سے گزری ـــ میں نے سوچا تھا کہ دو ایک دن آرام کرنے کے بعد کوشش کروں گا کہ بات دراصل یہ ہے، میں سوچ رہا تھا کہ ریڈیو اُڑا لے جانے والا شیر معمولی ذہانت والا نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ شکاری کی موجودگی کی اطلاع

پا کر چپ چاپ اس گرد و نواح سے کھسک ہی جائے۔ اور اس طرح میں کسی خطرے کا مقابلہ کیے بغیر اپنا مضمون مکمل کر لوں۔ آخر میں بس اتنا ہی لکھ دینا کافی ہو گا کہ اس شیر کو مارنا ہی آسان کام نہیں کیونکہ وہ کوئی بدروح ہے جو شیر کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کوئی ایسا ریڈیو سیٹ جھٹک لے جاتی ہے۔ جس کی بیٹریاں جلد ایکز ہاسٹ ہونے والی نہ ہوں۔ بس ثابت یہ ہوا کہ ریڈیو کی کمرشل سروس جانوروں اور بدروحوں میں بھی مقبول ہو رہی ہے۔

بہرحال میں یہی سب کچھ سوچتا اور اونگھتا رہا۔ پھر دفعتاً اپنے ٹرانسسٹر ریڈیو سیٹ کا خیال آیا جو میز پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اونگھنا ملتوی کر کے اُسے احتیاط سے صندوق میں ہی رکھ دینا مناسب سمجھا۔

دوسرے دن بستی والے ایک پاڑا لے کر آئے اور مجھے اطلاع دی کہ مچان بھی بن کر تیار ہو گئی ہے۔ میں نے کہا۔ "میاں عقل کے ناخن لو۔ وہ خون کا پیاسا نہیں ہے کہ تم پاڑا لے کر آئے ہو کہیں سے بڑے سائز والے ریڈیو گرام کا انتظام کرو۔ جسے وہ آسانی سے اُٹھا نہ سکے۔ پس جس وقت وہ اُسے اُٹھانے کی کوشش کر رہا ہو گا، اطمینان سے گولی مار دوں گا۔"

اُنھوں نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ پچھلی رات بھی اُس نے ایک آدمی کے مکان میں گھس کر اُس کا ریڈیو سیٹ تلاش کیا تھا اور ناکام رہنے پر اُس کے خاندان والوں کو گندی گندی گالیاں دی تھیں۔ پھر طرح طرح کی دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا تھا۔

"گالیاں دی تھیں، شیر نے ...؟" میں نے خوفزدہ انداز میں چیخ کر پوچھا۔

"جی جناب!" اطلاع دینے والے نے کہا۔ "اسی لیے آپ کو تکلیف دی ہے۔ ورنہ شکاری تو بہت مل جاتے ہیں۔"

"میں بالکل نہیں سمجھا بھائی صاحب!" میں نے بوکھلا کر کہا۔ کہنے لگے۔ "آپ سلیمانی ہیں نا۔ وہ جو ہوتا ہے نقشِ سلیمانی اس سے بھی بلائیں بھاگ جاتی ہیں۔ ہم نے کہا، آپ ہی ٹھیک رہیں گے۔"

میں کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم سے زبردست غلطی سرزد ہوئی ہے۔ ارے میاں، میرا ادبی نام ہُدہُد سلیمانی ہے۔ ورنہ خاکسار کو بندے علی خاں کہتے ہیں۔ نقشِ سلیمانی اور چیز ہے۔"

"کچھ بھی ہو، پیچھا چھڑا لیے اس سے ہمارا!" جواب ملا۔ مجھے سخت غصہ آ رہا تھا ان نامعقولوں پر۔ "ارے کم بختو! رائفل گولیاں اُگلتی ہے۔ تعویذ نہیں برساتی۔ یہ کس جنجال میں آ پھنسا!"

لیکن اب تو آ ہی پھنسا تھا۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔

"یارو آج تک کسی نے اس شیر کو دیکھا بھی ہے؟" میں نے اُن سے سوال کیا۔ کئی آدمیوں نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے سوچا اگر وہ واقعی شیر ہے تو یہ ریڈیو والی بات قطعی بکواس ... اشیر کی آڑ میں کوئی آدمی ریڈیو سیٹوں پر ہاتھ صاف کر دیتا ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ چلو ان لوگوں پر تھوڑا رعب ہی پڑے گا جو مجھے کسی دوسری دنیا کی مخلوق سمجھ کر عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اُن سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے رائفل سنبھالی۔ پتلونوں کا گٹھڑ بغل میں دابا اور جنگل کی طرف چل پڑا۔ کئی آدمی پاڑے کو ہانکتے ہوئے میرے پیچھے آ رہے تھے۔

شیر کے پنجوں کے نشانات ڈھونڈنے کی مہم وہ لوگ پچھلے ہی دن سر کر چکے تھے اور اسی کے مطابق ایک جگہ مچان بھی بنا ڈالی تھی ... یہاں ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ خیال تھا شیر لنچ کے بعد یہاں پانی پینے آتا ہے۔ میں نے ان گدھوں سے کہا تو پھر یہاں پاڑا باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لنچ کے بعد وہ صرف سوئیٹ ڈش پسند کرے گا۔

"جاؤ۔ جا کر حلوا پکوا لاؤ۔" میں نے اُن میں سے سب سے زیادہ عقلمند آدمی سے کہا۔

اُس نے کہا۔ "صاحب! شکر تو بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ کہیے تو زرِ مبادلہ کا حلوا پکوا لاؤں؟"

میں نے کہا۔ "کچھ بھی کرو۔ لنچ کے بعد وہ پاڑے کی طرف ہرگز راغب نہ ہو گا۔ ویسے میں پاڑا بھی بندھوائے دیتا ہوں۔ تم خود ہی دیکھ لو گے۔"

اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ پہلے پاڑے ہی والی تدبیر آزمائی جائے۔ ناکام رہی تو پھر حلوا بھی پکوا دیا جائے گا۔ میں نے سوچا کون احمقوں سے مغز پچی کرے۔ چلو یوں ہی سہی۔

اُنھوں نے پاڑا تالاب کے کنارے ایک درخت سے باندھ دیا اور خود ہانکا کرنے چلے گئے۔ میں مچان پر جا چڑھا۔

ہانکا کرنے والوں کا شور بہت دور سے سنائی دے رہا تھا۔ میں شیر کا منتظر رہا۔ گٹھڑ میں سے ایک پتلون کھینچ کر سامنے رکھ لی تھی۔ پاڑا تالاب کے کنارے کھڑا اطمینان سے جگالی کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دور سے شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی۔ میں نے رائفل ہاتھ سے رکھ کر پتلون سنبھال لی۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شیر بھی آ گیا۔ بڑی شان سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا تالاب کی طرف آ رہا تھا۔ پتلون بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔ پاڑے کی بُری حالت تھی۔ دفعتاً شیر نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ اُس سے کہا۔ "برخوردار پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں لنچ کر چکا ہوں۔ شکاری صاحب چُغد معلوم ہوتے ہیں۔ تمھیں خواہ مخواہ تکلیف دی۔"

اپنے لیے لفظ "چُغد" سُن کر میں غصے سے پاگل ہو گیا اور یہ بھی بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے بے حد خائف تھا۔

میں نے اپنا سینہ ٹھونک کر کہا۔ "میں ادیب ہوں۔"

پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ میری طرف مڑ کر حقارت سے مسکرایا ہے۔

اُس نے کہا۔ "تب تم چُغد سے بھی سینئر ہو۔ یعنی اُلّو۔"

میں نے رائفل سنبھالتے ہوئے اُسے للکارا۔ "زبان سنبھال کر بات کر۔"

وہ ہنسنے لگا۔ دیر تک ہنستا رہا۔ پھر بولا۔ "رکھ دو۔ رائفل رکھ دو۔ کیوں ایک گولی ضائع کرو گے۔ ٹرانسسٹر ریڈیو سیٹ ہو تو نکالو۔ میں ابھی تمھارے سامنے یہیں دم توڑ دوں گا۔"

"کیا بکواس ہے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"یقین کرو۔ میرے دوست۔" وہ بے حد سنجیدہ ہو کر گلوگیر آواز میں بولا۔ "کلامِ اقبال کی قوالی سُن کر میں زندہ نہیں بچوں گا۔ دراصل خودکشی ہی کی نیت سے میں بستی والوں کے ٹرانزسٹر سیٹ اُٹھا لاتا ہوں۔ ایک دن اتفاق سے اسی وقت میں نے ریڈیو کھولا۔ کہیں سے کلامِ اقبال کی قوالی ہو رہی تھی۔ میری حالت بگڑنے لگی۔ بس مرنے ہی والا تھا کہ کم بخت بیٹریاں ایکز ہاسٹ ہو گئیں۔ ریڈیو بند ہو گیا اور میں نہ مر سکا۔ آدمی تو کیا، اس مُلک کے جانوروں کو بھی زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں۔ جہاں اقبال جیسا عظیم المرتبت شاعر قوالوں کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ کیا بتاؤں دل کی کیا حالت ہوتی ہے، جب اس ملکوتی کلام پر بے ہنگم اور بھدی موسیقی کے بغدے چلتے ہیں۔ آخر اس عظیم شاعر کو کس گناہ کی پاداش میں قوالوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ شاید نظریۂ پاکستان پیش کرنے کی سزا ہے۔"

... پھر وہ شیر دفعتاً نظروں سے اوجھل ہو گیا اور میرے کانوں سے ڈھولک اور ہارمونیم کا شور ٹکرانے لگا۔ کچھ ایسی اذیت ہوئی کہ بے ساختہ اُچھل پڑا۔ آنکھیں مل کر دیکھا تو ایڈیٹر صاحب سامنے بیٹھے ہوئے جھومتے نظر آئے۔ ریڈیو پوری آواز سے کھلا ہوا تھا اور شبِ جمعہ ہونے کی وجہ سے قوالی جاری تھی ... قوال صاحب فرما رہے تھے ؎

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا نہ کرے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

سچ کہتا ہوں، میرا بھی یہی جی چاہا کہ خودکشی کر لوں۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ چکی ہے کہ قوال حضرت کلامِ اقبال پر اصلاح بھی فرمانے لگے۔

میں نے ریڈیو کی طرف ہاتھ اُٹھا کر ایڈیٹر صاحب سے پوچھا۔ "یہ کیا بک رہا ہے؟"

جھومتے ہوئے بولے۔ "پتا نہیں۔ ویسے میں پسند نہیں کرتا کہ میرے دفتر میں کام کرنے والا کوئی آدمی کرسی پر ہی سونا شروع کر دے۔"

"میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا یہ صحیح شعر پڑھ رہا ہے؟" میں نے غصیلی آواز میں پوچھا۔

"مجھے شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم میری بات کا جواب دو۔"

"دیتا ہوں جواب!" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا ... ہاتھ بڑھا کر ایڈیٹر صاحب کا گریبان پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں وہ بھی اُٹھتے چلے آئے۔

اب اُن کی گردن میری گرفت میں تھی اور میں دانت بھینچے کہہ رہا تھا ...

"شیر کے شکار سے پہلے تم جیسے مٹی کے شیروں کا شکار ہونا چاہیے جو ادب کے سچے خادم بھی ہیں اور جنھیں کلامِ اقبال کی قوالی پر حال بھی آتا ہے۔"

وہ غل مچاتے رہے لیکن میں نے انھیں اُس وقت تک نہیں چھوڑا، جب تک کہ اُن کا دم نہیں نکل گیا۔

چبھتے ہوئے جملوں اور نوکیلے استعاروں سے ترتیب دیا ہوا یہ ہوائی قلعہ
آپ سب کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔
اس تحریر کو پڑھ کر آپ کو کوئی ہوائی قلعہ تعمیر نہیں کرنا پڑے گا

ابنِ صفی

ہوائی قلعے

یُوں بھی اگر ٹرین تین گھنٹے لیٹ ہو تو ویٹنگ رُوم میں لیٹ کر ہوائی قلعے بنانا صحت کے لیے بے حد مفید سمجھا جاتا ہے پھر مجھ سا بااصول آدمی تو ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کب فرصت میسّر ہو اور کب اپنے دُشمنوں سے انتقام لینا شروع کر دے۔ لال قلعے پر دھاوا بولا جا سکتا ہے۔ ۔۔ لیکن ہوائی قلعے پر دُشمنوں کے فرشتوں کی بھی نظر نہیں پڑ سکتی لہٰذا دُشمنوں سے نپٹنے کے لیے ہوائی قلعے سے زیادہ محفوظ اور کوئی مورچہ نہیں ہو سکتا۔ ہوائی قلعے میں بیٹھ کر بہت بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُسے یُوں سمجھیے کہ آپ اپنے حریف کے ہاتھوں پٹ جانے کو انسانیت تصوّر کرتے ہیں اور دُم دبا کر بھاگنے کو انسانیت کی معراج۔ ۔۔ لیکن رات کو سونے سے قبل آپ کو اپنے حریف پر بہت شدّت سے غصّہ آتا ہے اور آپ ہوائی قلعے میں بیٹھ کر اُسے اس قدر پیٹتے ہیں کہ وہ بے دم ہو کر "رحم" "رحم" چلّانے لگتا ہے اور آپ اس کی فریاد کی پروا کیے بغیر کروٹ بدل کر سو جاتے ہیں۔ اگر اس وقت ہوائی قلعہ آپ کو پناہ نہ دے تو آپ رات بھر جھلا جھلا کر رزمیہ شاعری ہی کرتے رہ جائیں۔

بہرحال، ہوائی قلعہ بہت عمدہ چیز ہے۔ میں پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ تھوڑا بہت وقت ہوائی قلعے میں ضرور گزارا کیجیے۔۔ ہاں تو میں آپ کو اپنے ہوائی قلعے سے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔ میرا کوئی دُشمن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا میرے ہوائی قلعے کو تو بالکل ویران ہونا چاہیے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ خانۂ خالی را زن می گیرد۔ ابتدا میں دُشمن والی بات تو میں نے یونہی کہہ دی تھی۔ میرے اپنے ہوائی قلعے میں دُشمن کا نام و نشان تک نہیں۔ میں تو ویٹنگ رُوم کی ایک کرسی پر نیم دراز کچھ اِس انداز سے اپنے ہوائی قلعے کی بُنیاد رکھ رہا تھا کہ ٹرین میں تِل رکھنے کی بھی جگہ نہ ہوگی۔ صرف ایک چھوٹا سا سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ خالی ہوگا۔ اس میں ایک ملائک فریب دوشیزہ بیٹھی رسالہ "مایا مچھندر" کا وہی شمارہ دیکھ رہی ہوگی جس میں میری تصویر چھپی ہے میں فلسفیوں کی سی شان کے ساتھ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوں گا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھے گی اور میں بڑی بے پروائی سے برتھ پر بیٹھ کر سگریٹ سُلگاؤں گا۔۔۔ پھر بے خیالی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینک دُوں گا اور جلی ہوئی دیا سلائی ہونٹوں میں دبا کر کسی موٹی سی کتاب پر نظریں جما دوں گا۔۔۔ پھر کتاب بند کر کے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹرین کے باہر پھیلی ہوئی تاریکی میں گھورنے لگوں گا۔ اِس دوران میں وہ بے چینی سے پہلو بدل بدل کر کھکھارتی رہے گی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا ہوگا کہ مجھے کس طرح اپنی طرف متوجہ کرے۔ تھوڑی دیر بعد ڈرتے ڈرتے کہے گی۔ "کیا میں آپ کی یہ کتاب دیکھ سکتی ہوں؟"

پہلے تو میں اُسے قہر آلود نظروں سے گھُوروں گا پھر ڈانٹ کر کہوں گا۔ "ضرور دیکھیے۔۔۔ لیکن احتیاط سے!" وہ کتاب اُٹھا کر ورق گردانی شروع کر دے گی اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی کن انکھیوں سے دیکھتی جائے گی میں خیالات میں ڈُوب کر اپنے بال مٹھیوں میں جکڑنے لگوں گا۔ کچھ دیر بعد وہ کہے گی "گستاخی ضرور ہے۔۔ لیکن کیا میں آپ کا نام پُوچھ سکتی ہوں؟"

"مجھے چرخل شیطان کہتے ہیں!" میں کراہت سے ہونٹ سکوڑ کر کہوں گا۔

"اُف فوہ! آپ ہی چرخل شیطان ہیں!" وہ پُرمسرت لہجے میں چیخے گی۔ "آپ ہی کی تصویر "مایا مچھندر" میں چھپی ہے؟ آپ کے افسانوں میں بڑا سوز و گداز ہوتا ہے!" ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہہ جائے گی اور میں بدستور نفرت سے ہونٹ سکوڑے رہوں گا۔ "مجھے حسن آرا کہتے ہیں۔ مجھے بھی لکھنے کا شوق ہے۔ آپ کے افسانوں کی عاشق ہوں اور ہر اس رسالے کی خریدار ہوں جس میں آپ لکھتے ہیں۔ اوہ، میں اس وقت کتنی خوش ہوں!"

"لیکن مجھے بالکل خوشی نہیں ہوئی!" میں کہوں گا۔

"اوہ۔۔۔ کتنے ظالم ہیں آپ! میں آپ کی تصویر دیکھ کر ہزار جان سے عاشق ہو گئی تھی!" وہ سسکیاں لیتی ہوئی کہے گی۔

"مگر مجھے ایک جان سے بھی آپ کی پروا نہیں!" میں مُسکرا کر کہوں گا۔

"دیکھیے! یہ نہ کہیے! ورنہ میں ابھی چھلانگ لگا دوں گی!" وہ سچ مچ چھلانگ لگا دینے پر تیار ہو جائے گی اور میں جھپٹ کر اُس کے ہاتھ سے اپنی کتاب چھین لوں گا۔ "ہائے ظالم" کہہ کر وہ اس قدر روئے گی کہ ہچکیاں لگ جائیں گی۔۔۔ پھر میں کوشش کروں گا کہ مجھے اس پر رحم آ جائے لہٰذا میں کہوں گا۔ "خیر اگر آپ اصرار کرتی ہیں تو میں ہر قسم کی قومی خدمت کے لیے تیار ہوں!" وہ خوش ہو جائے گی اور پھر ہم ایک ڈوئیٹ گائیں گے۔

ہوائی قلعہ ابھی زیرِ تعمیر ہی تھا کہ ٹرین آ گئی۔ قُلی جھپٹ کر اندر آیا اور میرا سامان اُٹھا کر ٹرین کی طرف لپکا۔ ہوائی قلعے کے مطابق واقعی ٹرین میں کہیں تِل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ رات کا وقت تھا اِس لیے لوگ تِل رکھنے کی جگہ بھی پیر پھیلائے سو رہے تھے۔ اتفاق سے سیکنڈ کلاس کا ایک چھوٹا سا کمپارٹمنٹ خالی نظر آیا لیکن قریب پہنچنے پر مایوسی ہوئی کیونکہ پُورا کمپارٹمنٹ مخصوص تھا۔ دراصل جس ٹرین کے لیے میں نے ریزرویشن کرایا تھا، وہ پہلے ہی چھُوٹ گئی تھی۔ میں دیر سے اسٹیشن پہنچا تھا۔ خیال تھا کہ دُوسری ٹرین کے لیے ریزرویشن کرا لُوں گا لیکن کھڑکی پر جواب ملا کہ جگہ ملے تو بیٹھ جائیے گا۔ اِس گاڑی پر ریزرویشن نہیں ہو سکے گا۔ میں اس کمپارٹمنٹ کے سامنے سے ہٹنے ہی والا تھا کہ اندر سے آواز آئی "تشریف لائیے!"

ایک نہایت متین اور باوقار نوجوان سامنے کی برتھ پر کمبل اوڑھے بیٹھا تھا۔ میں نے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے چند ٹوٹے پھوٹے جملے بطور اظہارِ تشکر عرض کیے۔ کمپارٹمنٹ میں دو ہی افراد تھے ایک وہ خود اور دُوسرے صاحب لحاف میں سرتاپا لپٹے ہوئے خرّاٹے لے رہے تھے۔ خرّاٹوں کی مردانگی سے مجھے بے حد مایوسی ہوئی۔ کاش ہوائی قلعے کے مطابق مجھے ڈوئیٹ گانے کا موقع مل سکتا۔ ایک کمپارٹمنٹ میں مرد ہی مرد۔۔ لاحول ولا قوۃ اوہ کتنا پھیکا رہے گا یہ سفر بھی۔۔ میں یہ سوچ کر نڈھال ہو جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ نوجوان بولا "بے تکلفی معاف کیا آپ مجھے سگریٹ پلائیں گے؟"

"حاضر ہے!" میں نے ڈبّہ بڑھا دیا۔

"شکریہ!" کہہ کر اُس نے سگریٹ سُلگایا اور دو تین کش لینے کے بعد سر ہلا کر فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "کتنا سکون ملتا ہے سگریٹ سے لیکن حرکت کا نام زندگی ہے تو سکون حرکت کی ضد ہے اور اگر حرکت زندگی ہے تو سکون موت۔۔۔ لہٰذا اگر سگریٹ کو ملک الموت کہا جائے تو کیا حرج ہے؟"

میں ہنس پڑا۔ میں نے سوچا کہ یہ ظالم بھی ہوائی قلعے بنانے کا اسپیشلسٹ معلوم ہوتا ہے لیکن منطق ذرا غلط ہے۔۔۔

"ہنسیے نہیں!" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "افلاطون کہتا ہے کہ ہنسنے سے آنسو بنتے ہیں!"

میں پھر ہنس پڑا۔

وہ سر ہلا کر بولا۔ "آپ بہت مُوڈ میں معلوم ہوتے ہیں۔ اچھّا کوئی اچھّی سی نظم سنائیے!"

اب میں گھبرا گیا۔ مجھ میں ایک بہت بڑی کمزوری ہے کہ گھبراہٹ میں بُری طرح ہکلانے لگتا ہوں۔ لہٰذا نہایت آسانی سے ہکلانے لگا۔ "مم۔۔۔ میں۔۔ واللہ۔ ششش۔۔ شاعر۔۔ نن نہیں ہوں!"

"تو پھر آپ یہاں آئے کیوں؟ میں نے شاعر ہی سمجھ کر آپ کو قابلِ رحم سمجھا تھا۔ براہِ کرم آپ اگلے اسٹیشن پر اُتر جائیے گا"

میں گڑگڑانے لگا لیکن اُس نے ایک نہ سُنی! مجبوراً ذہن پر زور دینا پڑا۔ یکایک ایک صاحب کی نظم "سکوت" یاد آگئی اور میں انہیں کی طرز میں رو رو کر گانے لگا۔

"اس نظم کا عنوان سکوت کیوں ہے اس میں تو سکوت بالکل نہیں پایا جاتا" وہ ڈپٹ کر بولا۔

"کوئی اور عنوان سمجھ میں نہیں آیا تھا!"

"اب اسے سکوت کی بجائے" غل غپاڑہ" کر دو!"

"جی۔ بہت اچھا" میں نے بے بسی سے کہا۔

"ٹھیک۔۔ اچھا یہ بتاؤ کبھی تم نے محبت بھی کی ہے یا نہیں؟ ذرا ایک سگریٹ اور"

اس کی یہ بے تکلفی انتہائی تکلیف دہ محسوس ہوئی تھی۔ بُرے پھنسے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کا ہوائی قلعہ بہت مستحکم معلوم ہوتا ہے۔ خدا ہی لاج رکھے۔ بہرحال میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ "محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے"

"نہایت فرسودہ نظریہ ہے!" وہ بیزاری سے بولا "والد صاحب بھی یہی کہتے ہیں لیکن میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا"

"لیکن مجھے آپ کے والد صاحب سے اتفاق ہے"۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"والد صاحب" وہ حقارت سے بولا۔ "اگر والد صاحب شہتوت نہ کھاتے تو واقعی بڑے آدمی ہوتے۔ یور اولڈ ہارٹ"

"اچھا تو آپ کے والد صاحب شہتوت بھی کھاتے ہیں" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"للہ اسے نہ دُہراؤ۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے" وہ بیزاری سے بولا "ہاں تو میں محبت کے متعلق کہہ رہا تھا۔۔۔ تو تم نے کبھی محبت نہیں کی۔ بہت ڈرپوک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مجھے دیکھو میں نے کئی بار محبت کی ہے۔ تم نے کبھی بھینس کو جُگالی کرتے دیکھا ہے؟"

میں نے گڑبڑا کر پان تھوک دیا۔

"زیادہ نہیں تھوڑے سے احمق ضرور ہو۔ میں نے یہ کب کہا تھا کہ پان تھوک دو۔ مجھے جگالی کرتی ہوئی بھینس بہت اچھی لگتی ہے۔ غالباً تمہیں بھی پسند ہو گی؟"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "آپ کسی کالج میں لیکچرار تو نہیں ہیں؟"

"بکواس مت کرو۔ مجھے چڑ چڑا یہ اچھی نہیں لگتی میں مسافروں سے اُن کے نام بھی نہیں پوچھتا۔ ممکن ہے، تمہارا نام اس قسم کا ہو کہ مجھے سُن کر مغموم ہونا پڑے۔۔"

میں سوچ رہا تھا کاش اس کمپارٹمنٹ میں بھی تل رکھنے کی جگہ نہ ہوتی۔

"کیا سوچنے لگے" وہ تھوڑی دیر بعد بولا "ضرور تم نے محبت کی ہے۔ تمہارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے تمہاری ناک کی بناوٹ بتاتی ہے کہ تم نے کوئی گہری چوٹ کھائی ہے۔ تمہارے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ کوئی دُکھ بھرا گیت گانا چاہتی ہے۔ مجھے سناؤ میں تمہاری داستانِ غم سنوں گا۔۔۔ سُناؤ نا"

اب مجھ پر بوکھلاہٹ کا دورہ پڑا۔ لاکھ ذہن پر زور ڈالا لیکن کوئی ایسا مستحکم ہوائی قلعہ نہ مل سکا جس میں بیٹھ کر اس کا مقابلہ کر سکتا۔ ناچار میں نے بے بسی سے دانت نکال کر شکست تسلیم کر لی۔

"سُناؤ نا!" وہ دوبارہ ڈپٹ کر بولا۔

"میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے کبھی اس کا اتفاق نہیں ہوا" میں نے رو دینے کا تہیہ کر کے کہا۔

آدمی کچھ سمجھ دار تھا، مُسکرا کر بولا "خیر نہیں سُناتے تو نہ سُناؤ لیکن میں تمہیں اپنی داستانِ محبت ضرور سُناؤں گا۔۔۔ یہ وہ آگ ہے جس نے میرے وجود کو خاکستر کر دیا ہے۔ میں جلا جا رہا ہوں۔۔۔ تھکا جا رہا ہوں۔۔۔ کیا یہاں تھوڑا ٹھنڈا پانی مل سکے گا۔۔۔ نہیں، خیر جانے دو۔۔۔ ایک سگریٹ۔۔۔ ہاں تو اس کا نام مُنشی رحمت النساء تھا۔۔۔ ہنسو نہیں، واللہ اس نے مُنشی کے امتحان میں بہت اچھے نمبر حاصل کیے تھے۔ وہ بہاروں کا گایا ہوا ایک غیر فانی گیت تھی۔ وہ گیت جس نے اُفق کے دُھندلکوں سے بلند ہو کر دُنیا کے ہر عرض البلد اور طول البلد کا سفر کیا تھا۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ خطِ استوا سے بحرِ منجمد شمالی تک اسی کا راج تھا۔ یقین نہ آئے تو کیپٹن اسکاٹ کی ڈائری دیکھو۔ کیپٹن اسکاٹ اپنی منزلِ مقصود تک بڑی مشکل سے پہنچا تھا لیکن یہاں ایک آدمی اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ وہاں اس کے مُلک کا پرچم لہراتے دیکھ کر اسکاٹ کا دل ٹوٹ گیا۔ ہائے اور وہ پھر کبھی واپس نہ آسکا۔ اس کی لاش وہیں کہیں برف کے کسی تودے میں دبی پڑی ہو گی۔ برف میں لاشیں محفوظ رہتی ہیں۔ میرے دادا کے چھوٹے بھائی پہلی جنگِ عظیم میں لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ میرے دادا بھی اسی مورچے پر لڑ رہے تھے۔ اُنہوں نے تین مہینے تک لاش برف میں دبا رکھی تھی اور اسے اپنے ساتھ واپس لائے تھے۔ آہ دادا مرحوم کے چھوٹے بھائی!" وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو گیا اور دیر تک تاریکی میں ڈوبے ہوئے میدانوں میں کچھ تلاش کرتا رہا۔ پتہ نہیں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

"اور وہ رحمت النساء؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا۔

"چھوڑو بھی۔۔۔ دُوسری داستان سُنو۔ میں نے کئی بار محبت کی ہے! سنو! اُس کا نام چاندنی تھا۔۔۔ آہ وہ کتنی حسین تھی جب وہ چلتی تو ایسا لگتا جیسے دیولوک کی کوئی رقاصہ ناچتے وقت ہولے ہولے ٹھوکریں دے رہی ہو۔ جب وہ جھکی میں اپنی ستواں ناک دبا کر چھینکتی تو فضاؤں میں ایک رسیلے گیت کی مدھم جھنکاری گونج کر رہ جاتی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میں نے سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیا ہو، اس راگنی کی دیوی کے انگ انگ سے جوانی کے مدھر گیت پھوٹتے معلوم ہوتے تھے۔ جس دن والد صاحب نے اُسے پہلے پہل دیکھا تو میرے جسم سے پسینے کی دھار بہہ نکلی۔ اسی دن سے وہ کہنے لگے تھے کہ محبت کی نہیں جاتی، بلکہ ہو جاتی ہے۔ اگر تم میرے والد صاحب سے ملو تو تمہیں بے حد مایوسی ہو۔۔۔ غالباً۔ منن۔۔۔ منن۔۔ رول۔ رول۔۔۔ گھوں۔۔۔ بھن بھن۔۔۔ بھن۔۔۔" وہ بولتا رہا لیکن مجھے اس کی آواز ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے دُور۔۔۔ بہت دُور۔۔۔۔۔ اُفق میں کوئی مچھر بھنبھنا رہا ہو۔ "اچھا تو۔۔۔ تم سو رہے ہو!" وہ میرا شانہ پکڑ کر دھاڑا۔

"نہیں تو۔۔۔" میں نے چونک کر خواہ مخواہ مُسکرانے کی کوشش کی۔

"اچھا تو بتاؤ۔۔۔ میں ابھی کیا کہہ رہا تھا!"

"آپ۔۔۔ کک۔۔۔ کیا۔۔ کہہ۔۔۔۔" میں پھر ہکلانے لگا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں اُٹھا کر باہر پھینک دُوں تو کیسی رہے؟"

"ارے۔۔۔ ہی ہی ہی!" میں نے اخلاقاً دانت نکال دیے۔

"اُف فوہ۔۔۔ بالکل وہی انداز ہے۔ ایک بار پھر اسی طرح ہنسو! للہ پھر ہنسو! ہائے بالکل اسی طرح وہ بھی ہنستی تھی۔۔۔ اُف چاندنی۔۔۔ ہائے چاندنی۔ کتنی حسین تھی وہ کہکشاں کی بیٹی!۔۔۔ ہائے وہ بربطِ ناہید کی ایک نہ ٹوٹنے والی نَے تھی۔ جب پہلے پہل اس سے میری نگاہیں آٹھ ہوئیں!۔۔۔ ہنسو نہیں۔ آٹھ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ عینک بھی لگاتی تھی۔ اس عینک کے شیشے اتنے دبیز تھے کہ اُس کی آنکھیں مجھے صاف نہیں نظر آتی تھیں۔ اس لیے میں بھی عینک لگانے لگا تھا۔۔۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"جب پہلے پہل نگاہیں چار ہوئیں!" میں نے۔۔۔۔ بے دلی سے یاد دلایا۔

"تمہیں ضد ہو گئی ہے!" وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ "میں کہتا ہوں نگاہیں آٹھ ہوئیں اور تم وہی چار چار بکے جا رہے ہو!"

مجھے کچھ کچھ غصہ آچلا تھا۔ لہٰذا میں نے جھلا کر کہا۔ "نگاہیں ہر حال میں چار ہوں گی چاہے آپ عینک لگائیں چاہے وہ عینک لگائے۔۔۔ عینکوں سے نگاہوں کی تعداد نہیں بڑھ سکتی۔"

"بڑھ کیوں نہیں سکتی؟"

"ہرگز نہیں بڑھ سکتی!"

"میں بڑھا سکتا ہوں"

"آپ کو کوئی حق حاصل نہیں" میرا غصہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔

"نگاہیں آٹھ ہوئیں۔۔۔ نگاہیں آٹھ ہوئیں۔۔ نگاہیں نا ٹھ"

غالباً اُسے بھی جوش آگیا تھا۔

"آپ محاورے کا خون کر رہے ہیں!" میں پُوری طاقت سے چیخا۔

"محاورے کی ایسی تیسی۔۔۔ میں تمہارا خُون کر دوں گا"

وہ میری طرف جھپٹا اور میں نے بدحواسی میں چھلانگ لگائی تو سوئے ہوئے آدمی پر جا پڑا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "کون ہو تم۔۔۔" وہ خوفزدہ آواز میں چیخا۔

"مم۔۔۔ مم۔۔۔ مسافر۔۔۔!" میں ہکلایا۔

"لیکن یہاں کیوں آئے ہو۔۔۔ یہ کمپارٹمنٹ ریزروڈ ہے"

"اُنہوں نے بُلا لیا تھا" میں نے سہم کر اس خونخوار کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ تو پاگل ہے!"

"ارے!" بیساختہ میرے مُنہ سے نکلا۔ اب جو میں نے غور سے دیکھا تو اس کے پیر میں زنجیر نظر آئی جس کا دُوسرا سرا برتھ کے پائے سے بندھا ہوا تھا۔ وہ اب بھی کھڑا چیخ رہا تھا۔ "نگاہیں آٹھ ہوئیں۔۔۔ نگاہیں آٹھ ہوئیں۔۔۔ نگاہیں آٹھ۔۔۔ بات تیری محاورے کی ایسی تیسی۔۔۔ بات تیری۔۔۔!"